طلوع اسلام

مارچ ۱۹۵۲

مقالہ خصوصی۔ قتل مرتد

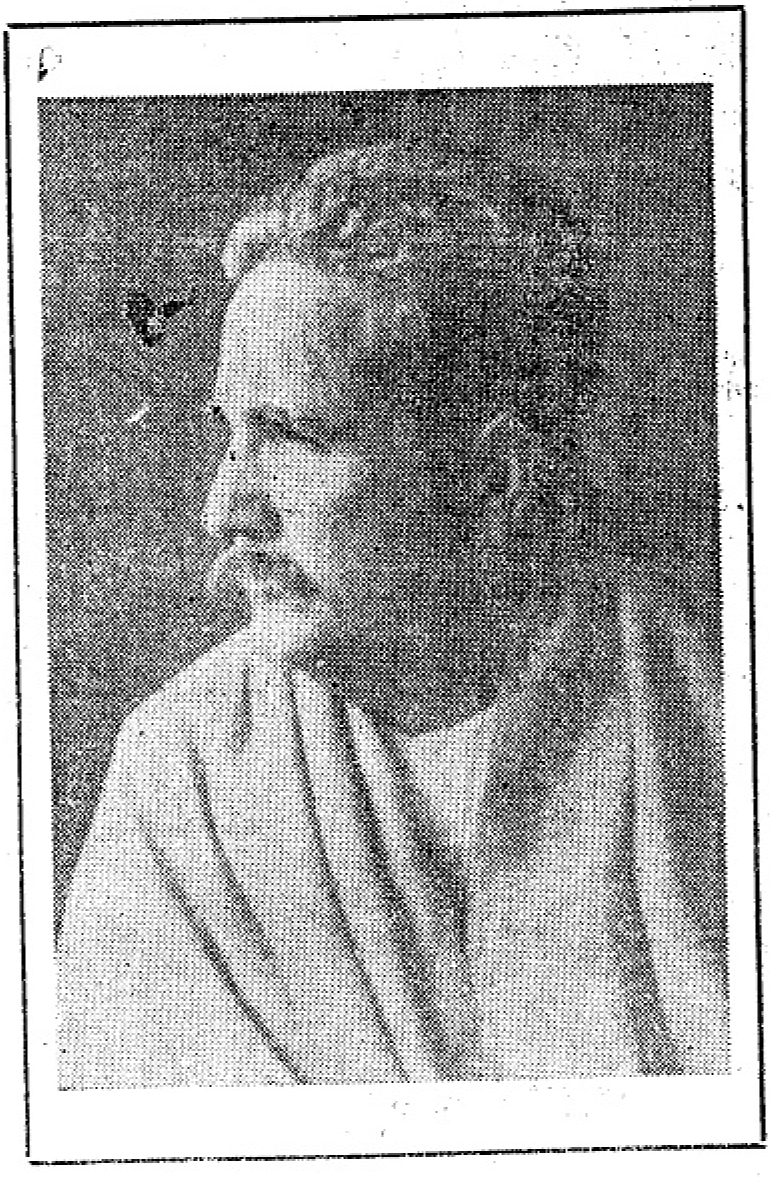

-/10/-

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں — ہرقسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

اور پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیازآگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	محمد یونس	دس آنے (پاکستانی)
,, غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۳	مارچ ۱۹۵۲ء	جلد ۵

فہرست مضامین

لمعات	۴ - ۱۳
قتلِ مرتد	۱۴ - ۵۵
مالی مدد (نظم) (اسد ملتانی)	۵۶
باب المراسلات	۵۷ - ۶۱
۱- حیات بعد الممات ــــــ رحمۃ اللعالمین	
۲- بیتابیٔ تمنا	
۳- ضروری وضاحت	
حقائق و عبر	۶۲ - ۶۷
اشتہارات	۶۸ - ۷۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

لمعات

جس "احتفال العلماء" کا ذکر سابقہ اشاعت میں کیا گیا تھا، بالآخر وہ وسط فروری میں کراچی میں منعقد ہو گئی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ احتفال "مؤتمرِ عالمِ اسلامی" کی ریہرسل (REHEARRSAL) تھی۔ اور وہ بھی فل ڈریس (FULL-DRESS) نہیں۔ تمام عالمِ اسلامی کے علمائے عظام جمع ہوئے تھے یہ سوچنے کے لئے کہ مسلمانوں پر جو عالمگیر مصائب و نوازل چھا رہی ہیں ان کا علاج کیا ہے۔ اور ماحصل تھا اس اجتماع کا کچھ عصرانے، کچھ عشائیے، کچھ تقریریں اور کچھ ریزولیوشن۔ اور ان کے بعد دعائے خیر۔ جہانتک تقریروں کا تعلق ہے (وہ عربی میں ہوں یا اردو میں) ان کا عام انداز یہ ہو چکا ہے کہ "مسلمانوں پر چاروں طرف سے مظالم ہو رہے ہیں۔ دولِ یورپ ہمیں اپنے استعمار و استبداد کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ مراکش میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ٹیونس میں بے گناہوں کو پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ مصر کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ عراق کا خون نچوڑا جا رہا ہے۔ ایران کی کھال کھینچی جا رہی ہے۔ بہارستانِ کشمیر خونِ ناحق کے چھینٹوں سے لالہ زار بن رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے ان فرزندانِ توحید کے خلاف، جو ایک دن ساری مہذب دنیا کے مالک تھے۔ جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے تھے۔ جنہوں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے، جن کا پرچم عرب سے سندھ اور مراکش سے چین تک لہرا رہا تھا۔ حضرات سوچئے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے! اس کا جواب صاف ہے۔ ہم میں اتحاد نہیں۔ یگانگت نہیں۔ وحدتِ مرکز نہیں۔ ائتلافِ قلوب نہیں۔ اخوتِ دینی نہیں۔ یہ کیوں نہیں؟ اس لئے کہ ہم میں انتشار ہے۔ تشتت ہے۔ افتراق ہے۔ پراگندگی ہے۔ ہم الگ الگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ قوموں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے؟ بس یہ کہ ہم بھائی بھائی بن جائیں۔ ہم ایک دوسرے کے گلے مل جائیں۔ ہم میں مواخات پیدا ہو جائے۔ ہم میں رابطۂ اتحاد پیدا ہو جائے۔ دنیا ایک بار پھر **واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً** کا نظارہ دیکھ لے۔ اگر تم میں یہ چیز پیدا ہو گئی تو تمہاری لُٹی ہوئی عظمتیں، تمہاری چھنی ہوئی ثروتیں، تمہاری غصب شدہ سلطنتیں ایک ایک کر کے واپس مل جائیں گی اور پھر ساری دنیا اسلام کے نیرِ درخشاں سے جگمگا اٹھے گی اور اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ

کی وفا تو نے محمدؐ سے تو ہم تیرے ہیں　　یہ زمیں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں"

ان تقریروں اوران کے بعد چند ریزولیوشنوں کے بعد' سمجھ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی مل گیا اور ان کی مصیبتوں کا علاج بھی ہوگیا! یوں تو اس قوم سے یہ مذاق ایک مدت سے ہوتا چلا آرہا ہے لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد' اس کی طُرفہ ماجرائی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اب جو کچھ ہوتا ہے "آل مسلم" پیمانے پر ہوتا ہے اور اس معرکے میں حضرات علمائے کرام پیش پیش ہوتے ہیں۔

بعض ذہنوں میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ طلوع اسلام' علما حضرات (یا مولوی صاحبان) کی اسقدر مخالفت کیوں کرتا ہے؟ یہ سوال فی الواقعہ ایسا ہے جس کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ طلوع اسلام کے نزدیک مولوی صاحبان کا وجود' ہمیشہ سے اسلام کے لئے مہیب خطرے کا موجب رہا ہے اور آج یہ خطرہ اور بھی شدت اختیار کر رہا ہے۔

قوموں کی زندگی ہمیشہ ان کے نظریۂ حیات کے مطابق بنتی ہے۔ جس قسم کا تصورِ حیات (آئیڈیالوجی) اسی قسم کی سطحِ زندگی۔ دنیا میں بالعموم دو قسم کے نظریاتِ زندگی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد و متبائن ہیں۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان اپنی مصلحتوں کے پیش نظر اپنے معاملات کے فیصلے کرتا رہے۔ جو روش اُسے منفعت بخش دکھائی دے' اسے اختیار کرے۔ جس سے نقصان کا احتمال ہو اُسے چھوڑ دے۔ صحیح اور غلط کا معیار فقط اپنا نفع یا نقصان ہو۔ اس روش کو "دنیاوی نظریۂ زندگی" یا "مادی تصورِ حیات" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مبحثِ زیرِ نظر کے اعتبار سے اسے "لامذہبیت" کی زندگی کہہ لیجئے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا مسلک ہے جس کی رو سے انسان بعض باتوں پر ایمان رکھتا ہے۔ بعض سے انکار کرتا ہے۔ بعض کو جائز سمجھتا ہے' بعض کو ناجائز خیال کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی معاملہ سامنے آئے' اس کے لئے ضروری ہے کہ جائز کو اختیار کرے اور ناجائز سے اجتناب برتے۔ معاملاتِ زندگی میں اپنے اوپر مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کی پابندیاں عائد کرے۔ اس روش کا نام' عام اصطلاح میں "مذہبی زندگی" ہوتا ہے۔

حضرات انبیاء کرامؑ نوعِ انسانی کو اول الذکر نظریۂ حیات سے باز رکھنے اور موخر الذکر تصورِ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرنے کیلئے تشریف لاتے رہے۔ اس باب میں ان کا طرزِ عمل اور طریق کار کیا ہوتا تھا' اس کے لئے ہم حضور ختم المرسلینؑ کے تبلیغی مشن کو سامنے لاتے ہیں۔ حضورؐ کے سامنے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو مادی نظریۂ حیات کے قائل تھے۔ یعنی لامذہبیت کی زندگی کے مدعی۔ آپ نے ان کے سامنے "مذہب"[لہ] پیش کیا۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو پہلے ہی "مذہبی نظریۂ حیات" کے حامل تھے۔ حضورؐ نے انھیں بھی مخاطب کیا۔ (بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو ان "اہل کتاب" کو زیادہ تفصیل' شدت اور وسعت سے مخاطب کیا)۔

لہ واضح رہے کہ ہم "مذہب" کا لفظ عرفِ عامہ کے اعتبار سے محض سمجھانے کی غرض سے استعمال کر رہے ہیں ورنہ حضرات انبیاء کرامؑ (منجملہ نبی اکرمؐ) دین پیش کیا کرتے تھے نہ کہ مذہب۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مادی نظریۂ زندگی" کے حاملین کے سامنے تو حضورؐ نے "مذہب" پیش کیا، لیکن جو پہلے ہی مذہبی نظریۂ حیات کے داعی تھے، ان کے سامنے کیا پیش کیا؟ اس کا جواب صاف ہے کہ ان کے سامنے بھی حضورؐ نے "مذہبی نظریۂ حیات" پیش کیا۔ یہاں لازماً یہ سوال اٹھتا ہے کہ جو لوگ پہلے ہی مذہبی نظریۂ حیات کے قائل تھے ان کے سامنے مذہبی نظریۂ حیات پیش کرنے سے مفہوم کیا تھا؟ یہ ہے وہ سوال جس پر ذرا زیادہ گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کی طرف انبیاء کرامؑ (مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ) تشریف لائے۔ وہ انبیاء کرامؑ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے دیئے ہوئے مذہب کے پیرو ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ (معاذ اللہ) جو مذہب حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ سچا نہیں تھا۔ اس لئے انہیں اس مذہب کی بجائے اس نئے مذہب کو اختیار کرنا چاہئے جو یکسر صداقت پر مبنی ہے۔ لیکن نبی اکرمؐ نے یہ نہیں کہا۔ اس کے برعکس کہا کہ حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کرام سچے تھے اور خدا کی طرف سے سچا مذہب لائے تھے۔ ان میں اور خود محمد رسول اللہؐ میں کوئی تفریق نہیں۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر صورت حالات یہی ہے تو پھر ان انبیاء کرامؑ کے دیئے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر اس نئے مذہب کو کیوں اختیار کیا جائے؟ سوال واقعی بڑا اہم تھا لیکن اس کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔ کہا یہ گیا کہ جو مذہب اُن لوگوں کے پاس اُس وقت تھا، وہ وہ نہیں تھا جو اُن کے انبیاء نے انہیں دیا تھا۔ ان کے انبیاء نے انہیں جو کچھ دیا تھا وہ منزل من اللہ (خدا کی طرف سے نازل شدہ مذہب) تھا۔ لیکن جس مذہب کو وہ لوگ ان انبیاء کا دیا ہوا مذہب بتا رہے ہیں، وہ منزل من اللہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اسلئے انہیں اس مذہب کو چھوڑ کر اس مذہب کو اختیار کرنا ہوگا جو منزل من اللہ ہے۔ یہ تھی دعوت نبی اکرمؐ کی۔

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے۔ نبی اکرمؐ کی دعوت صرف یہی نہ تھی کہ جن لوگوں کے پاس مذہب نہیں ہے انہیں مذہب کی طرف بلایا جائے۔ آپ کی دعوت یہ بھی تھی کہ جن لوگوں کے پاس وہ مذہب نہیں ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا، انہیں اُس مذہب کی طرف دعوت دی جائے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

لہٰذا لامذہبیت کی زندگی کے مقابلہ میں جس مذہبی نظریۂ زندگی کو انسانیت کی فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا گیا ہے وہ اس مذہب کی زندگی ہے جو منزل من اللہ ہو۔ نہ کہ ہر قسم کے مذہب کی زندگی۔ لیکن ایک سوال تو غیر مذہبی اور مذہبی زندگی کا تھا، لیکن خود مذہبی زندگی کے اندر اس سے بھی اہم سوال منزل من اللہ مذہب اور غیر منزل من اللہ مذہب کا تھا۔ نبی اکرمؐ کی ساری زندگی غیر منزل من اللہ مذہب کے حاملین کے خلاف جدوجہد میں بسر ہوئی۔ اور ان لوگوں نے بھی "منزل من اللہ مذہب" کی دعوت کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ ایک کشمکش تھی مسلسل۔ ایک تصادم تھا غیر منقطع۔ انہوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح نبی اکرمؐ ان کے ساتھ مفاہمت پر راضی ہو جائیں۔ لیکن انہیں واضح الفاظ میں جواب دیا جاتا رہا کہ غیر منزل من اللہ مذہب کی منزل من اللہ مذہب سے مفاہمت کیسی؟ مذہب وہی مذہب ہے جو منزل من اللہ ہے۔ اسلئے اگر مذہبی زندگی بسر کرنے کا دعویٰ ہے تو انہیں غیر منزل من اللہ

مذہب کو چھوڑ کر، منزل من اللہ مذہب کو اختیار کرنا ہوگا۔ (فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا۔ ۲/۱۳۷ ۔ اگر یہ (اہل کتاب) بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ ہدایت پائیں گے)۔ حتیٰ کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ منزل من اللہ مذہب کی حفاظت کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو غیر منزل من اللہ مذہب کے حاملین کے خلاف بھی اسی طرح تلوار اٹھائی جائے جس طرح ان کے خلاف اٹھائی جاتی تھی جو "غیر مذہبی" نظریۂ زندگی کے قائل تھے۔ اس لئے کہ اگرچہ اول الذکر لوگ اپنے آپ کو مذہبی نظریۂ حیات کے پیرو کہتے ہیں لیکن یہ لوگ "ما انزل اللہ" پر ایمان نہیں لاتے اس لئے ان کا دعوے مذہبیت کوئی وزن نہیں رکھتا۔

واضح رہے کہ ان لوگوں کا مسلک یہ نہیں تھا کہ ہم "ما انزل اللہ" کو نہیں مانتے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جس مذہب کو ہم مانتے ہیں وہ "منزل من اللہ" ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ منزل من اللہ نہیں ہے، اس لئے اُن کا دعویٰ قابلِ قبول نہیں۔

یہ تھی وہ جنگ جو غیر منزل من اللہ مذہب کے حاملین کے خلاف، منزل من اللہ مذہب کے حامل، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقائے کار نے جاری رکھی۔ ھی حتیٰ مطلع الفجر۔

ہم بھی آج ٹھیک اسی مقام پر کھڑے ہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے سامنے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو مادی نظریۂ زندگی (یعنی لامذہبیت) کو صحیح روشِ حیات سمجھ رہے ہیں۔ یہ اہلِ مغرب یا مغرب زدہ مشرکین کا گروہ ہے۔ ہماری جنگ ان کے بھی خلاف ہے۔ ہم انھیں مذہبی نظریۂ حیات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مذہبی نظریۂ حیات کا قائل ہے۔ ان میں ایک طبقہ تو وہ ہے جسے "غیر مسلم اہل مذاہب" کہا جاتا ہے۔ ہماری ان کے خلاف بھی جنگ ہے۔

لیکن اہلِ مذاہب کا دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نمائندے ہمارے "علمائے کرام" یا مولوی صاحبان ہیں۔ مقصد زیرِ نظر کے لئے ان کی حیثیت وہی ہے جو نبی اکرمؐ کے مخاطب اہل کتاب کی تھی۔ یعنی جس طرح نبی اکرمؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ وہ مذہبی نظریۂ زندگی کے حامل تو ضرور ہیں لیکن جس مذہب کو وہ سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں وہ "منزل من اللہ" مذہب نہیں ہے۔ اور قیمت اسی مذہب کی ہے جو منزل من اللہ ہو۔ اسی طرح ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ جس مذہب کے حامل "علماء کرام" یا "مولوی صاحبان" ہیں وہ مذہب "منزل من اللہ" نہیں ہے۔ ان کا مذہب اسی قسم کا مذہب ہے جس قسم کا مذہب عہد نبی اکرمؐ (یا آج کے) اہل کتاب کا ہے۔ یعنی ان کے پاس وہ مذہب نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ پر نازل کیا تھا۔ ان کے پاس وہ مذہب ہے جو نبی اکرمؐ کے بعد، انسانی ذہنوں نے پیدا کیا۔ اس کا نام "عجمی اسلام" ہے[1]۔

---

[1] اس مقام پر ایک مرتبہ پھر تذکرۂ ابو الکلام صاحب آزاد کے اس اقتباس کو سامنے لایئے جو طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں درج کیا گیا تھا۔ وھو ہذا مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے ...... آج ہمارے مدارس میں جو علوم 'باسم اصل و اساسِ علوم شرعیہ' پڑھے پڑھائے جاتے ہیں اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیا دی ان کی تحلیل کرے تو کھل جائے کہ کسقدر حصہ ان کا شریعت اصلیہ اور دین الخالص سے مرکب ہے اور کسقدر اس فتنۂ عالم آشوب یونانیت و عجمیت کا ...... ان من العلم جھلاً۔

(ہم قرآن کے ابلاغ میں، منزل من اللہ مذہب کو الدین سے تعبیر کرتے ہیں اور غیر منزل من اللہ مذہب (عجمی اسلام) کو "مذہب" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اب آئندہ سطور میں یہی دونوں اصطلاحیں استعمال کی جائیں گی۔ ان کا فرق ہمیشہ پیش نظر رکھئے)۔ ہم ارشاد خداوندی کی تعمیل میں اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس غیر منزل من اللہ مذہب کے خلاف اسی شد و مد سے جہاد کریں جس انداز سے نبی اکرمؐ نے کیا۔ (یہ اتباع سنت رسول اللہؐ ہے)۔ اس کے لئے ہمارے سامنے بھی پہلا قدم وہی ہے جو نبی اکرمؐ کے سامنے تھا۔ نبی اکرمؐ "غیر منزل من اللہ مذہب" کے مدعیان کے ایک ایک دعوے کو لیتے اور ان سے کہتے کہ لاؤ وہ تورات اور وہ انجیل جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی اور اس میں دکھاؤ یہ کہاں لکھا ہے۔ بعینہ یہی مسلک ہمارا ہے۔ ہم مولوی صاحبان کے اس عجمی اسلام کی ایک ایک شق کو لیکر ان سے یہ کہتے ہیں کہ لاؤ اس کتاب کو جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ پر نازل کیا تھا۔ اور دکھاؤ کہ اس میں یہ کہاں لکھا ہے۔ اس اہم فرق کو نمایاں طور پر سامنے رکھئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم پر (معاذ اللہ) خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ اس لئے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ منزل من اللہ ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ جس مذہب کو تم منزل من اللہ کہہ کر پیش کرتے ہو یہ بتاؤ کہ وہ کتاب اللہ میں کہاں ہے؟ نیز اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر ہم نے ان کی مثال عہد نبی اکرمؐ کے اہل کتاب سے دی ہے تو اس سے مطلب کیا ہے؟ مطلب صرف یہ ہے کہ اہل کتاب نے، اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر، انسانوں کے خود ساختہ مذہب کو اختیار کر رکھا تھا اور اس کی نسبت کرتے تھے اپنے انبیاء کی طرف۔ اسی طرح ہمارے ارباب شریعت نے بھی کتاب اللہ کو متروک و مہجور بنا کر انسانوں کے ساختہ پرداختہ مذہب کو اختیار کر رکھا ہے اور اس کی نسبت کرتے ہیں ذات رسالتمآبؐ کی طرف۔ اس لئے جو حیثیت قرآنی دین کے سامنے اہل کتاب کے مذہب کی تھی وہی حیثیت قرآنی دین کے مقابلے میں ہمارے علماء کرام کے مذہب کی ہے۔

یہ ہے ہمارا موقف اور یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم مولوی صاحبان کے پیش کردہ مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس باب میں ہماری ایک مشکل ایسی ہے جو 'غیر مسلم اہل مذاہب' کے مقابلے میں کبھی پیش نہیں آسکتی۔ آپ نے اکثر وہ مناظرے دیکھے ہوں گے جو مسلمانوں اور غیر مسلم اہل مذاہب (مثلاً عیسائیوں) کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان میں کسی غیر مسلم اہل مذہب نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جس مذہب کو میں پیش کر رہا ہوں وہ وہی ہے جسے محمدؐ رسول اللہ نے دنیا کو دیا تھا۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں مسلمان مناظر کی پوزیشن بڑی صاف اور مرحلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ (خود نبی اکرمؐ کے مخاطبین، اہل کتاب بھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ہمارا مذہب وہی ہے جسے آپ پیش فرما رہے ہیں)۔ لیکن مولوی صاحبان کے مقابلے میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ جس مذہب کو وہ پیش کرتے ہیں وہ وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے دنیا کو دیا تھا۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا ذہنی الجھاؤ جو عام طور پر وجہ پریشانی فکر و نظر بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ان حضرات کے ساتھ بہت سی مقدس نسبتیں بھی وابستہ ہیں۔ "صاحبان علم و فضیلت"۔ "حاملین شرع مبین"۔ "وارثین علم الانبیاء"۔ "جانشینان ائمہ کرام"۔ "مستخلفین اسلاف عظام"۔ ان کے مقابلے میں عوام بچارے جاہل اور تعلیم یافتہ طبقہ دین کے علم (قرآن) سے بالعموم ناواقف ہوتا ہے۔ ان حالات میں وہ ذہنی الجھاؤ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بڑی جانگسل مشکلات کا موجب بن جاتا ہے۔ یہی وہ مشکلات ہیں جو قدم قدم پر ہماری راہ میں پیش آتی ہیں۔ لیکن مشکلات کے اس تمام ہجوم اور موانع کے

انبوہ میں جو چیز ہمارے لئے موجبِ تقویت ہے وہ یہ ہے کہ منزل من اللہ دین، اللہ کی کتاب (قرآن) میں حرفاً حرفاً محفوظ ہے اور مولوی صاحبان کی ہزار سالہ "عجمیت ویونانیت" اس میں ایک نقطے کی تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکی۔ یہ سوال کہ دین صرف منزل من اللہ ہو سکتا ہے اور منزل من اللہ سب کا سب قرآن کے اندر ہے عجمی اسلام کی راہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل تھا۔ اس دقت کے پیش نظر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ منزل من اللہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی مثل (مثلہ معہ) اور بہت کچھ بھی ہے۔ (یعنی روایات) اور اگر کبھی قرآن کے "منزل من اللہ" میں اور روایات کے "منزل من اللہ" میں اختلاف ہو تو روایات قرآن پر قاضی اور اس کی ناسخ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اصلی اور واجب الاتباع منزل من اللہ، روایات ہیں۔ یہ وہ سب سے بڑا فریب ہے جسے غیر منزل من اللہ مذہب اپنے منزل من اللہ ہونے کے سلسلے میں وجہِ پریشانی فکر ونظر بناتا ہے لیکن، ساحرین دربارِ فرعون کی نظربندی کی طرح، یہ فریب صرف اس وقت تک اثر انداز رہتا ہے جب تک قرآن کا عصائے کلیمی سامنے نہ آئے۔ جونہی وہ سامنے آیا، اس نگاہ بندی کا طلسم ٹوٹا۔

آپ کسی مولوی صاحب اور عیسائی پادری کے مناظرہ کو سامنے لائیے۔ مولوی صاحب عیسائیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ پیش کریں گے کہ جس انجیل کو تم منزل من اللہ کہتے ہو اس کے لئے کوئی سند نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہی انجیل اپنے متبعین کو دی تھی۔ بلکہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ یہ اناجیل حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد مرتب ہوئیں اس لئے انھیں دین کی یقینی سند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا تمہارا دین منزل من اللہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلے میں ہمارا قرآن دیکھو کہ آج تک حرفاً حرفاً وہی چلا آتا ہے۔ مولوی صاحب فریقِ مقابل کو شکست دینے کے لئے قرآن کو بطور دلیل استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد جب فاتح ومنصور اپنے حواریوں کی طرف لوٹتے ہیں تو قرآن کو پھر جزودان میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں اور ان کتب روایات کو جو بعینہٖ اسی طرح مرتب ہوئی تھیں جس طرح اناجیل (بلکہ انجیل کے مقابلے میں رسول اللہؐ کی وفات کے بہت زیادہ عرصے بعد) دین کے یقینی صحیفے قرار دیکر ان کے پیش کردہ مذہب کو منزل من اللہ ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ اس باب میں ان میں اور عیسائی پادری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ ہے جو کچھ دین کے معاملے میں "علمائے کرام" کی طرف سے ہو رہا ہے۔

پھر سن لیجئے کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ

(i) منزل من اللہ دین قرآن کے اندر ہے۔

(ii) علمائے کرام جس مذہب کے علمبردار ومحافظ ہیں وہ منزل من اللہ دین نہیں، انسانی ذہنوں کا پیدا کردہ مذہب ہے۔

(iii) دین وہی قابل قبول ہے جو منزل من اللہ ہو۔

(iv) نبی اکرمؐ نے بھی غیر منزل من اللہ مذہب کے حاملین کو منزل من اللہ دین کی دعوت دی۔

(v) یہی دعوت آج ہماری ہے۔

(vi) علماء حضرات اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کے خلاف مسلسل جہاد کرنا ہے۔
(vii) ہم اپنے دعوے کیلئے قرآنی دلائل اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا جی چاہے ہم سے پوچھ لے۔
اب یہ دیکھئے کہ ہمارے نزدیک یہ خطرہ سب سے مہیب کیوں ہے؟

یورپ کی تاریخ پر غور کیجئے۔ اس میں سترہویں، اٹھارہویں صدی تک "غیر منزل من اللہ مذہب" کا نظریہ، ان کی زندگی کے ہر گوشے پر چھایا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہاں کی قومیں اوہام پرستیوں اور افسانہ تراشیوں کی جہالت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کا ردعمل ہوا تو انھوں نے اس مذہب کو از منۂ مظلمہ کی بھیانک یادگار تھا، جھٹک کر الگ پھینکدیا۔ بدقسمتی سے انھیں اس کے بدلے میں "منزل من اللہ مذہب" نصیب نہ ہوسکا اس لئے انھوں نے تنہا عقل کے زور پر زندگی کے مسائل سلجھانے شروع کئے۔ اس کا نام "مادی نظریۂ حیات" ہے۔ غیر منزل من اللہ مذہب چھوڑنے اور علم وعقل کی بنا پر تسخیر فطرت کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ساری دنیا پر چھاگئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیر منزل من اللہ مذہب میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ عقل کا مقابلہ کرسکے۔ چونکہ مسلمانوں کے ممالک میں بھی غیر منزل من اللہ مذہب رائج تھا اس لئے یورپین اقوام ان ممالک پر بھی چھاگئیں۔

مادی نظریۂ حیات (یا عقلِ تنہا) سے خارجی دنیا پر تو غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے انسان کی داخلی دنیا ایسی کشمکش کی آماجگاہ بن جاتی ہے جس سے دنیائے انسانیت جہنم میں بدل جاتی ہے۔ اسوقت اقوام مغرب کی یہی کیفیت ہورہی ہے۔

دنیا کو اس جہنم سے نکالنے کا ذریعہ صرف "منزل من اللہ مذہب" (یعنی الدین) ہے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ اگر انسانی دنیا کی تدریجی ترتیب کو سامنے رکھا جائے تو اس کی جدول یوں بنے گی۔

(۱) سب سے نیچے کا مرحلہ۔ "غیر منزل من اللہ مذہب" جس کا نتیجہ جہالت ودنائت اور مفاد پرستانہ استبداد وتغلب ہوتا ہے۔
(۲) اس سے اوپر کا مرحلہ۔ عقلِ بے باک کی حکمرانی۔ اس سے تسخیر فطرت تو ہوجاتی ہے لیکن انسان کی داخلی دنیا میں توازن قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا معاشرے میں فساد برپا ہوجاتا ہے۔
(۳) سب سے اوپر کا مرحلہ۔ منزل من اللہ مذہب (یعنی الدین) کا مقام۔ اس میں تسخیر فطرت بھی ہوتی ہے اور انسان کی داخلی دنیا میں حسن کارانہ توازن بھی قائم ہوجاتا ہے جو افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء کا موجب بنتا ہے۔

اسوقت صورت یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک مرحلۂ اول کے طبقۂ اسفل میں پڑے سڑرہے ہیں۔ لا یموت فیھا ولا یحییٰ۔ اقوام مغرب کی حالت یہ ہے کہ — عشق ناپید وخرد می گزدش صورتِ مار — ساری دنیا میں پاکستان ایک ایسا خطہ تھا جس میں ہنوز کوئی نظامِ معاشرت قائم نہیں ہوا تھا۔ خامۂ فطرت نے اس کی لوحِ جبیں خالی رکھی تھی کہ یہاں کے مسلمان، اس پر اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر لکھ لیں۔ ہمارا خواب یہ تھا کہ اس میں "منزل من اللہ" دین کا نظام قائم ہوجائے اور اس طرح اس کے حصے میں دنیا کی امامت آجائے۔ شروع شروع میں یہاں "غیر منزل من اللہ مذہب" کے حاملین (علماء حضرات) کا کچھ زیادہ اثر نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے دو ایک باتیں

ایسی پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے ان کا اثر پھر ابھر کر افق پر آ گیا۔ پہلی وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان میں کھانے پینے کی افراط تھی، اس لئے یہاں کی سرزمین، اسلامی ممالک کی جھلستی ہوئی فضاؤں میں رہنے والوں کے لئے بڑی جاذب بن گئی۔ چنانچہ وہاں سے "علمائے کرام" فوج در فوج ادھر آنے شروع ہو گئے۔ ایک تو ہر باہر سے آنے والا، خواہ مخواہ معتبر نظر آنے لگتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عرب و عراق و شام وغیرہ کے علاقوں سے مسلمانانِ ہند کو بڑی عقیدت رہی ہے۔ اس لئے ان حضرات کے لئے پاکستان مائدۃ من السماء (آسمان سے اترا ہوا خوانِ نعمت) بن گیا۔ ان لوگوں کی پے در پے یورشوں سے فضا میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی۔ لیکن علماء حضرات کے اثر کی اس سے بھی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ "امریکہ برطانیہ" بلاک کو ضرورت لاحق ہوئی کہ روس کی کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کے لئے مذہب کی دیواریں کھڑی کی جائیں۔ یہ دیواریں علماء کے ہاتھوں ہی سے کھڑی کی جا سکتی تھیں اسلئے کہ یہی لوگ اس "غیر منزل من اللہ مذہب" کے حامل ہیں جو خالصتہً دورِ ملوکیت اور سرمایہ پرستی کی پیداوار ہے اور جس کا فتویٰ یہ ہے کہ

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت بشرطیکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حدو نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء، مکانات۔ سواری، غرض کسی معاملے میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد (زمین) میں کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ . . . . . . اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی نہیں عائد کر سکتے۔ . . . . . جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ . . . پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو۔ . . . اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔
>
> (لہٰذا) سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔
>
> (مسئلہ ملکیتِ زمین۔ از سید ابو الاعلیٰ مودودی)

اس قسم کا مذہب چونکہ امریکی اور برطانوی سرمایہ پرستی کو بہت راس آتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنے سیاسی حریف (روس) کی یلغاروں کی روک تھام کا کام لے سکتے ہیں۔ اس لئے اس مذہب کے حاملین کو اپنے اثر و نفوذ کے لئے نہایت مساعد حالات ہاتھ آ گئے۔

یہ ہیں بدبختی سے وہ وجوہات جن کی بناء پر مولوی صاحبان کی اکھڑی ہوئی ہوا پھر سے بندھ گئی اور سرزمین پاکستان دینِ خداوندی کی بہارستان بننے کے بجائے، "حضرات علمائے کرام" کے غیر منزل من اللہ مذہب کا خارستان بن گیا۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری رہا

تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پاکستان اس سطح پر پہنچ جائے گا جس سطح پر آج دنیا کے دیگر اسلامی ممالک ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر آج پاکستان کو اسلامی ممالک کی امامت کا فخر حاصل ہے تو اس کا کیا راز ہے؟ اس کا راز صرف یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کا ایک طبقہ (انگریزوں کے اثر کی وجہ سے) مرحلہ اول (یعنی غیر منزل من اللہ مذہب کی پست ترین سطح) سے نکل کر مرحلۂ دوم (مادی نظریہ حیات کی سطح) پر پہنچ چکا ہے۔ بالفاظ دیگر انگریز جہاں اس ملک میں ریل، تار، پل، سڑکیں، ریڈیو، ہسپتال، اسکول، کالج، انگریزی زبان اور ۱۹۳۵ء کا ایکٹ (غرضیکہ وہ تمام ترقی یافتہ عناصر جن پر ہم آج ناز کر رہے ہیں) چھوڑ گئے ہیں، وہاں نظریۂ زندگی کے اعتبار سے ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر گئے ہیں جو (اگرچہ دینِ خالص کی سطح تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن) اوہام پرستانہ مذہب علمارِ کرام کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو عالم اسلامی میں پاکستان کی امامت کا اصل موجب ہے۔ یہ طبقہ سیرت کی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکا جہاں انسان کو منزل من اللہ دین پہنچایا کرتا ہے۔ اور قلبی اعتبار سے یہ بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہے جس میں اقوامِ یورپ کے افراد۔ لیکن بایں ہمہ، یہ طبقہ کم از کم غیر منزل من اللہ مذہب کے جذام سے ضرور صحت یاب ہو چکا ہے۔

پاکستان کے خواب کی قرآنی تعبیر تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ یہ طبقہ (جس نے غیر منزل من اللہ مذہب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا) منزل من اللہ دین کے فروغ کا باعث بنتا۔ لیکن اگر ہماری شامتِ اعمال سے ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو برسبیل تنزل، کم از کم اتنا ہی ہو جاتا کہ یہاں مغربی انداز پر عقل کی راہ نمائی عام ہو جاتی۔ تاکہ اگر ہم اپنی کوتاہیِ قسمت سے خدا تک نہ پہنچ سکتے تو کم از کم انسانوں کی صف میں کھڑے ہونے قابل تو ہو سکتے۔ لیکن بدبختی سے یہاں حالات ایسے پیدا ہوتے جا رہے ہیں کہ دینِ خداوندی کے فروغ کا تو ذکر کیا۔ رفتہ رفتہ عقل کی راہ نمائی بھی ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے اور ان کی بجائے مولوی کا غیر منزل من اللہ مذہب پھر سے کروٹیں لیکر بیدار ہو رہا ہے۔ اگر یہ حالات ایسے ہی رہے اور اس طرح یہاں غیر منزل من اللہ مذہب کے پاؤں جم گئے تو پھر خسر الدنیا والآخرۃ کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔

ہماری کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ حقیقی زندگی کا راز منزل من اللہ دین کے احیاء اور قیام میں ہے۔ اسی کا نام قرآنی نظام ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کمیونزم کے سیلاب سے بھی بچنا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ بھی قرآنی نظام کی تشکیل ہی ہے — غیر منزل من اللہ مذہب کسی صورت میں بھی اس طوفان کو روک نہیں سکتا۔ اسلئے کہ کمیونزم کی تخلیق اور ترویج کا ذمہ دار خود یہ مذہب ہے جو مفاد پرستانہ دور کی پیداوار ہے۔ لہٰذا جسقدر اس مذہب کو فروغ ہوگا اسی قدر کمیونزم کا خطرہ اور شدت اختیار کر جائے گا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم "علمارِ کرام" کے مسلک و مشرب کی اس قدر مخالفت کرتے ہیں۔ یہ مخالفت کسی فرد، کسی شخصیت، کسی گروہ یا کسی جماعت کی مخالفت نہیں۔ یہ مخالفت ہے درحقیقت اس نظریۂ زندگی کی جو غیر منزل من اللہ مذہب کی پیداوار ہے اور جس کی وجہ سے انسانیت ہمیشہ پستی کے عمیق غاروں میں رہی ہے اور جو مسلمانوں کی نکبت و زبوں حالی کا ذمہ دار ہے۔

ہمارے فریق مقابل میں بعض لوگ تو وہ ہیں جن کا ذریعۂ معاش ہی "مذہب" ہے۔ وہ دل میں سمجھتے ہیں کہ غیر منزل من اللہ مذہب کا نام اسلام نہیں لیکن وہ منزل من اللہ دین کے احیار کی مخالفت اسلئے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی روٹی چھنتی ہے۔ یہی یہود کے احبار و رہبان کی وہ جماعت تھی جس نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوتِ دین الحق کی مخالفت یہ کہہ کر کی تھی کہ

اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے، البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔ اسلئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہوجائیں گے۔ اسلئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ (انجیل برناباس۔ فصل ۱۴۲ء)

مولوی صاحبان میں سے اس طبقہ کا جس نے "مذہب" کو معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے دُہرا جرم ہے۔ ایک غیر منزل من اللہ مذہب کو اصلِ دین بنا کر پیش کرنا اور دوسرے اس مذہب کو اپنی مطلب براری کی آڑ بنانا۔ ان کا وجود معاشرہ کے لئے بڑی تباہی کا موجب ہے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو نہایت نیک نیتی سے غیر منزل من اللہ مذہب کو دینِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ ان کی نیک نیتی سے اس غلط نظریۂ حیات کے انجام و عواقب میں تو کمی نہیں آسکتی۔ زہر زہر ہی ہے خواہ اسے زہر سمجھ کر دیا جائے یا غلطی سے تریاق سمجھ کر۔ لہٰذا ہمارے لئے اس طبقے کی مساعی کی روک تھام بھی ضروری ہے کہ

چاں دانم کہ نابینا وچاہ است　　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہماری یہ مخالفت حق بجانب ہے یا نہیں۔ "غیر منزل من اللہ اسلام" کے حاملین کے متعلق ہم علیٰ وجہ البصیرت سمجھتے ہیں کہ

مرگ تو اہلِ جہاں را زندگی است

اور یہ بصیرت ہمیں قرآن اور سنتِ رسول اللہؐ سے حاصل ہوئی ہے جس نے غیر منزل من اللہ مذہب کے حاملین کے خلاف مسلسل جہاد کو ہر مومن کا فریضۂ زندگی بنایا۔ وبذالك امرت وانا اول المسلمین۔

ان حضرات میں سے جو بھی "غیر منزل من اللہ مذہب" کو چھوڑ کر منزل من اللہ دین کی طرف آجائے اس کے لئے ہمارا دیدۂ دل فرش راہ ہے۔ اس لئے کہ ہماری مخالفت ذاتی نہیں، اصولی ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

قتلِ مرتد

محشرستانِ "حکومتِ الٰہیہ" کا ایک خونچکاں منظر!

قرآن نے انسان اور کائنات کی دیگر اشیاء میں ایک بنیادی فرق بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیائے کائنات ایک لگے بندھے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ انھیں قطعاً اس کا اختیار نہیں کہ وہ جی چاہے تو اس قانون کے مطابق سرگرم عمل رہیں اور جی چاہے تو کسی اور روش پر چل نکلیں۔ پانی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کبھی نشیب کی طرف جائے اور کبھی جی میں آئے تو فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ آگ کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ کبھی حرارت دینے اور کبھی ٹھنڈک پہنچانے لگ جائے۔ اگر کبھی زمین اپنے راستے سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی پیدا کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رخ کو طرفۃ العین کے لئے خلافِ قاعدہ بدل لیں۔ غرضیکہ اس محیر العقول کارگہ عالم کا چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اپنے نظام سے سرتابی اختیار کرلے تو یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ زندگی اور اس کی ممکنات اس بنا پر قائم ہیں کہ خارجی کائنات کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت چل رہی ہے۔ سبح للہ ما فی السموٰت والارض۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کے قانون کے مطابق سرگرمِ سعی و عمل ہے۔ للہ یسجد من فی السموٰت والارض۔ ہر شے اس کے حکم کے سامنے سجدہ ریز ہے کل لہٗ قانتون۔ کسی کو اس کے قانون سے مجالِ سرتابی اور یارائے سرکشی نہیں۔

انسانی اختیار و ارادہ

جہانتک ضابطۂ زندگی کا تعلق ہے، انسان کو بھی اسی طرح قانونِ ہدایت دیدیا گیا جس طرح دیگر اشیاءِ کائنات کو۔ لیکن (اور یہ لیکن بہت اہم ہے) انسان کو اس کے ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ جی چاہے تو اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے اسے چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرلے۔ "آدم" کو اس "دنیا" میں بھیجنے کے ساتھ ہی کہدیا گیا کہ

فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (۲/۳۸)

جب میری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ ہدایت آئے تو جو اس قانون ہدایت کی اتباع کرے گا اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

ان کے برعکس

والذین کفروا وکذبوا بایٰتنا اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون (۲/۳۹)

اور جو لوگ اس ضابطۂ ہدایت سے انکار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا جس میں وہ رہیں گے۔

یہ دونوں راہیں بالکل واضح ہیں. اس کے بعد انسان پر کوئی جبر نہیں کہ وہ کونسی راہ اختیار کرے. وھدینہ النجدین (۹۰/۱۰) ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں" اسے گوشِ ہوش اور دیدۂ اعتبار عطا کر دیئے ہیں (فجعلنٰہ سمیعاً بصیراً ۔ ۷۶/۲) اسے راستہ دکھا دیا ہے (انا ھدینہ السبیل ۔ ۷۶/۳) اس کے بعد

اما شاکراً واما کفوراً (۷۶/۳)

وہ چاہے تو اسے اختیار کرے ۔ چاہے اس سے انکار کر دے۔

اس باب میں اس پر کوئی زبردستی نہیں۔ جور نہیں۔ استبداد نہیں۔

ضابطۂ خداوندی کے مطابق راہ اختیار کرنے کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے اور اس کے خلاف روشِ زندگی کا نام کفر ہے۔ ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے ضابطۂ ایمان کے اپنے تقاضے ہیں۔ جو اس راہ کو اختیار کرے گا اس کیلئے

ایمان اور کفر کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں

ان ضوابط کی پابندی لازمی ہوگی۔ لیکن اس باب میں کوئی زبردستی نہیں کہ انسان ضابطۂ ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا ضابطۂ کفر کے مطابق۔ بالفاظِ دیگر انسان کو یہ پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ ایمان اختیار کرے یا کفر۔ یعنی ایمان اور کفر کے معاملے میں انسان پر کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ یہ قرآن کا صاف، واضح اور غیر مبہم فیصلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر (۱۸/۲۹)

ان سے کہدو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق (نکھر کر سامنے) آگیا۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے۔

"فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" ضابطۂ قرآنی کا عمودی فیصلہ ہے جس کی بنیادوں پر اس کی تعلیم کی تمام عمارت اٹھتی ہے۔ جو ایمان کی راہ اختیار کرے گا وہ اس نظامِ خداوندی کے ثمرات و برکات سے فیض یاب ہوگا۔ جو اس کے خلاف روش پر چلے گا وہ اس کے عواقب و آلام سے دوچار ہوگا۔ فمن اھتدیٰ فلنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا (۳۹/۴۱)" جو راہِ ہدایت پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اس کو پہنچے گا اور جو گمراہ ہوگا تو اس گمراہی کا وبال اسی پر پڑے گا" وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کو زبردستی ایک خاص راہ (ضابطۂ ہدایت) پر چلانا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ انھیں بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح اختیار و ارادہ سے معطل کر کے، اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کر دیتا۔ خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا لیکن خدا کی مشیت نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا پروگرام ہی یہ تھا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیدیا جائے۔ اختیار و ارادہ دیکر اسے پھر زبردستی ایک خاص روش کا پابند بنانا، می نہ سزد خدائے را۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ سے کہدیا کہ تو اگر یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ زبردستی مسلمان بنا دیئے جائیں تو یہ چیز مشیتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر اسے یہی مطلوب ہوتا کہ انسان زبردستی مومن بنا دیئے جائیں تو وہ انھیں اختیار و ارادہ عطا ہی نہ کرتا۔

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعاً۔ افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین (۱۰/۹۹)

اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا تو روئے زمین کے تمام باشندے ایمان لے آتے۔ (لیکن اللہ نے انھیں مجبور نہیں پیدا کیا)
اس لئے تو کیا لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ضرور ایمان لے آئیں۔

کفر اور ایمان کے معاملے میں قطعاً زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں جور و استبداد کو کوئی دخل نہیں۔ اللہ نے انسان کو آنکھیں عطا کر دیں اور باہر سورج کی روشنی عام پھیلا دی۔ اب جس کا جی چاہے آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھ بھال کر چلے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے کنوئیں میں گر جائے۔

قد جاء کم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا۔ وما انا علیکم بحفیظ (۱۰۵/۶)

(ان سے کہدو کہ) تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ سو جو کوئی اس روشنی میں اپنی آنکھوں سے کام لیتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو آنکھیں بند کر کے چلے گا تو اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔ میں تم پر نگہبان نہیں مقرر کیا گیا (کہ تمہیں زبردستی ایک خاص راہ پر چلاتا رہوں۔)

اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا:

ولوشاء اللہ ما اشرکوا وما جعلناک علیھم حفیظاً وما انت علیھم بوکیل (۱۰۸/۶)

اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور ہم نے تجھے ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا۔ اور نہ تو ان کا وکیل ہے۔

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی (جن کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آتا ہے) اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اور کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کردو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس پر مامور کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری اور جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پر نہ رہ جائے۔ . . . . . اگر فی الواقعہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہیں بنا سکتا تھا؟[۱] (ص۵۶۰)

حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں قرآن نے ایک ایسی نہج زندگی پیش کی ہے جو انسانیت کی تاریخ میں سنگِ میل (LAND MARK) کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ذہنِ انسانی عہدِ طفولیت میں تھا تو اس وقت ایسے مواقع بھی آجاتے تھے جب اسے ورطۂ

حتی کہ معجزات بھی نہیں

حیرت میں ڈال کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یعنی خوارقِ عادت (یا معجزات) کی رُو سے ذہن پر اثر ڈال کر بات منوانے کی کوشش۔ لیکن اس نے کہا کہ اب انسان اپنے عہدِ شعور میں آپہنچا ہے اس لئے اب معجزات کے ذریعے سے اس سے بات نہیں منوائی جائے گی۔ اب ہر بات دلیل و برہان اور بصیرت و

[۱] ان تصریحات کو ذرا غور سے دیکھ لیجئے کیونکہ آگے چل کر یہی چیز بحث کا محور بنے گی۔

فراست کی رو سے تسلیم کرائی جائے گی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین۔ ان نشأ ننزل علیھم من السماء آیۃ فظلت اعناقھم لھا خاضعین (۲۶/۳-۴)

تو تو شاید اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ (اگر ہم چاہتے کہ یہ زبردستی ایمان لے آئیں تو ہمارے لئے یہ کونسا مشکل کام تھا کہ) ہم آسمان سے ایک نشان نازل کردیتے تو اس کے سامنے ان سب کی گردنیں جھک جاتیں۔

لیکن یہ ذہنی استکراہ ہوجاتا۔ اس لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ نبی اکرمؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ اب معجزات کا دور ختم ہوگیا[1]۔ اب ہر دعوے کا ثبوت، دلائل وبراہین سے پیش کیا جائے گا۔ اب دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت ہوگی۔

قل ھٰذہ سبیلی۔ ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی۔۔۔۔۔۔ (۱۲/۱۰۸)

ان سے کہدو کہ یہ ہے میرا راستہ۔ میں اور میرے متبعین علیٰ وجہ البصیرت خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

ہماری دعوت غور وفکر کی دعوت ہے۔ تدبر وتفکر کی دعوت ہے۔ ہماری اپیل عقل وبصیرت اور فہم وفراست سے ہے۔ اس میں کسی قسم کے جور واکراہ کو دخل نہیں۔ ایمان کے معاملے میں نہ ذہنی استکراہ کو کچھ دخل ہوگا نہ طبعی قوت (PHYSICAL FORCE)

کوئی استبداد نہیں

کو کوئی واسطہ۔ قرآن کفر وایمان کے معاملے میں طبعی قوت (استبداد) کے استعمال کو انسانیت کے خلاف سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سرخیلِ طائفۂ مستبدین، یعنی فرعونِ مصر کے خلاف جو فردِ جرم اس نے مرتب کی ہے اس میں واضح طور پر جتا دیا ہے کہ وہ کفر وایمان کے معاملے میں استبداد سے کام لیتا تھا۔ چنانچہ۔۔۔۔ جب اس کے دربار کے ساحرین حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے تو اس نے گرج کر کہا کہ آمنتم بہ قبل ان آذن لکم (۷/۱۲۳) کیا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آؤ گے؟ تم نے کفر اور ایمان کے معاملے میں اپنے فیصلے ہی کو قولِ فیصل سمجھ لیا اور یہ نہیں دیکھا کہ اس باب میں میری منشا کیا ہے؟ اچھا فلسوف تعلمون (۲۶/۴۹) تمہیں ابھی معلوم ہوجائے گا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ لاقطعن[2] ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم اجمعین (۲۶/۴۹)۔ "تمہارے ہاتھوں اور پاؤں میں الٹی ہتھکڑیاں ڈلواتا ہوں (یا انہیں کٹواتا ہوں) اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاتا ہوں۔" یہ تھا وہ فرعونی حکم جسے قرآن نے اس کے سنگین جرائم کی فہرست میں گنوایا ہے۔ اور یہ ایک فرعونِ مصر ہی پر کیا موقوف تھا۔ تمام فراعنۂ دہر اور نماردۂ عصر اپنے اپنے وقتوں میں یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ قوم شعیب نے حضرت شعیبؑ سے یہی کہا تھا کہ "ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے باہر نکال دیں گے۔ او لتعودن فی ملتنا (۷/۸۸)" یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آنا ہوگا۔" یہ روش، ہر رسول کے خلاف اختیار کی گئی۔

وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا (۱۴/۱۳)

ارباب کفر نے اپنے رسولوں سے یہی کہا کہ یا ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دینگے یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آجانا ہوگا۔

---

[1] اس کی تفصیل معراج انسانیت (مصنفہ پرویز صاحب) باب "معجزات" میں دیکھئے۔

[2] قطع ید کے معنی ہاتھ روک دینا، ہتھکڑیاں ڈالنا بھی ہوسکتا ہے۔

یعنی اگر یہاں رہنا چاہو تو ہمارے مذہب میں پھر سے واپس آجاؤ۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔

قرآن نے امم سابقہ کی فہرستِ جرائم میں اس جرم کو نمایاں حیثیت دیکر یہ واضح کر دیا کہ کفر اور ایمان کے معاملے میں جبر و استبداد انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے اس باب میں انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اب اس کے اس اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا، خدا کے فیصلے کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور شرفِ آدمیت کا سلب و نہب ہے۔ اس نے اس باب میں یہاں تک تاکید کر دی کہ

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلم اللہ۔ ثم ابلغہ مامنہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون (۹/۶)

اگر (جنگ کی حالت میں) ان مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

حالتِ جنگ میں بھی زبردستی نہیں کی جاسکتی

یعنی حالتِ جنگ میں بھی کسی کو بہ جبر و اکراہ مسلمان نہ بناؤ۔ مشرک کو قرآن سناؤ۔ پھر اسے اس کے مامن و مسکن تک بحفاظت پہنچا دو۔ اور اس طرح اسے مہلت دو کہ وہ تمہاری سنائی ہوئی بات (قرآن) پر غور و فکر کرے اور اس کے بعد اگر اس کا دل جھکے تو اس پر ایمان لے آئے۔ بلا علم و بصیرت ایمان لانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا تعلق یکسر انسان کے قلب سے ہے۔ جب تک انسان کا قلب مطمئن نہیں ہوتا اس میں ایمان داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ لوگ جو مسلمانوں کی فتوحات سے متاثر ہو کر ان کی جماعت میں شامل ہو گئے تھے وہ انھیں بھی کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اپنے آپ کو مؤمن مت کہو ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (۴۹/۱۴) اسلئے کہ ہنوز ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔ اور کفر ہو یا ایمان، اس کا تعلق اعماقِ قلب سے ہے۔ یہ اقرار جب تک دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا، اقرار کہلا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے کہدیا کہ اگر کسی شخص سے زبردستی کفر کا اقرار لے لیا جائے درآنحالیکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو تو اس کا اس قسم کا اقرار اُسے کافر نہیں بنا دیتا۔ من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان (۱۶/۱۰۶) جسے کفر پر مجبور کر دیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو وہ کافر نہیں ہو جاتا۔

لا اکراہ فی الدین

لہذا قرآن نے سمائے دنیا پر نور کے حروف سے لکھدیا کہ

لا اکراہ فی الدین۔ قد تبین الرشد من الغی۔ (۲/۲۵۶)

دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر اور اکراہ جائز نہیں۔ ہدایت اور گمراہی ایک دوسرے سے متمیز ہو چکی ہے۔

فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر۔ جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرے، جس کا جی چاہے کفر کی راہ پر چلے۔ لست علیھم بمصیطر۔ تم ان پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے کہ انھیں زبردستی مسلمان بناؤ۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم جس میں کوئی ابہام نہیں، کسی قسم کی گنجلک نہیں. کوئی پیچیدگی نہیں. کہیں ذرا سا شک و شبہ نہیں. لیکن قرآن کی اس قدر کھلی کھلی اور واضح تعلیم کے خلاف ہمارے مولوی کا مذہب یہ ہے کہ

مُلا کا مذہب

من بدل دینہ فاقتلوہ (روایت)

جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔

اور اس مذہب کے متعلق، امیر جماعت اسلامی، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا ارشاد ہے کہ کامل بارہ سو برس تک یہ امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے. چنانچہ وہ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" میں لکھتے ہیں:

> یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اس باب میں پہلا شک جو مسلمان کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دور آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کامل بارہ سو برس تک یہ تمام امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتل مرتد کے معاملے میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ (صـ)

مودودی صاحب کے ارشادات

یعنی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق لاَ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر اور اکراہ نہیں) کا ارشاد تو انیسویں صدی کے دور آخر کی "تاریک خیالی" کا نتیجہ ہے۔ اور دین بدلنے والے کو سولی چڑھا دینے (لاصلبنکم) کا "فرعونی حکم" (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) اسلام کے درخشندہ عہد کی یادگار ہے۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

کفر اور ایمان کے معاملے میں قرآن نے جو بنیادی تعلیم پیش کی ہے اسے آپ تفصیلی طور پر گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں. وہ اس باب میں ذرا سا بھی جبر و اکراہ گوارا نہیں کرتا چہ جائیکہ وہ دین بدلنے والے کو حوالۂ تیغ کر دے. لیکن مودودی صاحب نے اپنی "تحقیق" کا آغاز اس عنوان سے کیا ہے

حکمِ قتلِ مرتد کا ثبوت قرآن سے

یقیناً ہر وہ شخص جو دین میں قرآن کو حجت مانتا ہے، اس عنوان کو دیکھ کر رک جائے گا. کیونکہ ایک طرف وہ دیکھ چکا ہے کہ دین کے معاملے میں قرآن کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں. اور دوسری طرف اسے یہ عنوان دکھائی دیتا ہے کہ قرآن مرتد کے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے. لہٰذا یہ مقام فی الواقعہ بڑے غور و فکر سے دیکھنے کا ہے. مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو، اور بعد کے "مولویوں" نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو، ان کو اطمینان دلانے کے لئے میں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ (صـ۹)

ہم اس بات کو ذرا آگے چل کر بیان کریں گے کہ قرآن کی ایسی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف "مولویوں" نے کس مقصد کیلئے قتلِ مرتد کا حکم وضع کیا اور اسے کس مطلب کے لئے اسلام میں داخل کیا۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس باب میں قرآن سے کیا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے اور ان کی جرأت اور جہالت کا ماتم کیجئے۔ فرماتے ہیں:

مودودی صاحب کی قرآنی دلیل

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین ونفصل الاٰیات لقوم یعلمون ۔ وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون (التوبہ-۲)

پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کررہے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔

مودودی صاحب نے قرآن سے صرف یہی آیت پیش کی ہے۔ کوئی اور آیت اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی۔ اس آیت کا مندرجۂ صدر ترجمہ بھی انہی کا ہے۔ اب اس کی تفسیر بھی انہی کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:

یہ آیت سورۂ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اعلان برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو اسلام قبول کرلیں معاف کردیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں مدتِ مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنھوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو نہ ملک چھوڑا ہو ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ "اگر وہ توبہ کرکے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی" یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنی "اقرار اسلام سے پھر جانا" متعین کردیتا ہے اور اس کے بعد فقاتلوا ائمۃ الکفر کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔ (ص۹)

مودودی صاحب نے جب آیۂ مندرجہ صدر کی یہ تفسیر اپنے مریدوں کے حلقے میں بیان فرمائی ہو گی تو یقیناً وہ جھوم اٹھے ہوں گے اور اس کے بعد فضا میں اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہوں گی۔

ایک ــــ دیکھا! حضرت صاحب نے آج کیسا انوکھا نکتہ بیان فرمایا ہے۔ ہم ہر روز اس آیت کی تلاوت کرکے آگے بڑھ جاتے تھے لیکن کبھی ذہن اس طرف نہیں گیا کہ اس سے قتلِ مرتد کا حکم بھی نکل سکتا ہے۔

دوسرا ــــ اجی صاحب ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے۔ تیرہ سو برس سے مسلمان اس آیت کو پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ ہم نے آج تک کسی جگہ یہ نکتہ دیکھا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

تیسرا ــــ بھئی یہ باتیں کتابوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے خدا اور رسول کا مزاج شناس ہونا ضروری ہے۔ یہ چیزیں علم لدنی سے ملتی ہیں۔ ہر ایک کے نصیب میں کہاں۔

لیکن آپ ارادتمندوں کے اس حلقے سے ذرا باہر نکل کر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور کیجئے کہ کیا اس آیت کو کسی طرح بھی یہ معنی پہنائے جاسکتے ہیں! یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اُس قرآنی مملکت کی تکمیل ہو رہی تھی جس کی بنیاد بائیس سال پہلے نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے اُسی سرزمین میں (نہایت بے سروسامانی کی حالت میں) رکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم دونوں آباد ہوں گے۔ مسلمانوں سے کسی قسم کے معاہدے کی ضرورت نہیں تھی ۔ یہ مملکت خود انہی کی قائم کردہ تھی . . . . البتہ غیر مسلموں سے معاہدہ ضروری ہے کہ وہ حدودِ مملکت کے اندر امن و سلامتی سے رہیں گے۔ جب تک وہ اس معاہدے پر قائم رہیں گے انہیں ہر قسم کی حفاظت (جان، مال، آبرو، معابد کی حفاظت) کی ضمانت دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ عہد شکنی کرکے مملکت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو ان سے لامحالہ جنگ کی جائے گی۔ یہ وہ اصول ہے جس کی تصریح قرآن نے متعدد مقامات پر کی ہے۔ یہی صورت ۹ھ میں کفارِ مکہ کے معاملے میں پیش آئی۔ قرآن نے اعلان کردیا کہ ان کے لئے دو صورتیں ہیں:

آیت کا صحیح مفہوم

(i) یہ لوگ مسلمان ہو کر مملکتِ اسلامیہ کا جزو بن جائیں۔

(ii) یا غیر مسلم رہتے ہوئے امن و سلامتی کے معاہدے پر کاربند رہیں۔

لیکن (iii) اگر یہ نہ تو مسلمان ہوں اور نہ ہی . . . . معاہدے کی پابندی کرتا تو اس صورت میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ ان سے جنگ کی جائے۔ بات بالکل صاف ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

(الف) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو تمہارے دین کے بھائی بن جائیں گے۔ لیکن

(ب) "اسلام لانے کے بعد" اگر پھر "اپنے اقرارِ اسلام" سے پھر جائیں (یعنی مرتد ہو جائیں)

تو ان سے جنگ کی جائے۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ۔ مودودی صاحب اس کے معنی بتلاتے ہیں "اگر وہ اسلام لانے کے بعد اپنے اقرارِ اسلام سے پھر جائیں"۔ یعنی ان کے نزدیک عَهْدِهِمْ کے معنی ہیں کفار کا

اقرارِ اسلام" اور نکثوا ایمانھم[1] کے معنی سیاسی معاہدات کو توڑنا نہیں بلکہ مرتد ہوجانا ہے۔ ہم مودودی صاحب کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ سارے قرآن میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی دکھادیں جہاں عہدھم یا ایمانھم کے معنی" لوگوں کا اقرارِ اسلام" ہو۔ اس کے برعکس ہم وہ تمام مقامات دکھادیں گے جہاں قرآن نے عہد اور ایمان کے الفاظ کو سیاسی معاہدات کے لئے استعمال کیا ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کے ثبوت میں کوئی دلیل و برہان پیش کرو۔ لا برھان لہ۔ تم دیکھو گے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ یہ قرآن ہے۔ مذاق نہیں۔ مودودی صاحب نے آیۂ زیرِ نظر کے ترجمہ میں توسین میں یہ الفاظ لکھے ہیں (یعنی قبولِ اسلام کا عہد)۔ یہ خالص اپنی طرف سے اضافہ ہے اور افترا علی اللہ اور تحریف فی القرآن کی کھلی ہوئی مثال۔

آگے بڑھیے۔ اس آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ عہد اور معاہدے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں تو فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ کفر کے ان لیڈروں سے جنگ کرو۔ یہاں لفظ قاتلوا آیا ہے جس کے معنی جنگ کرنا ہے۔ مودودی صاحب اس سے قتلِ مرتد کی دلیل لاتے ہیں۔ اگر اس سے مراد قتل کرنا ہوتا تو اس کیلئے فاقتلوا آنا چاہئے تھا۔ جیسا کہ قرآن میں کئی ایک مقامات پر (قتل کرنے کے لئے) قتل آیا ہے۔ فقاتلوا (جنگ کرنے) کی صورت میں قتل کرنے اور قتل ہوجانے، دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ (اسی لئے قتال کے معنی ایک دوسرے کو مارنے کے ہیں)۔

اس کے بعد قرآن نے، کفار سے جنگ کرنے کی مزید توجیہ یہ کہہ کر فرمادی کہ انھم لا ایمان لھم۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ان کا جرم ارتداد ہوتا تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ان کا ایمان نہیں رہا۔

آخر میں فرمایا کہ ان کے ساتھ جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے لعلھم ینتھون۔ تاکہ وہ شاید اس طرح باز آجائیں۔ یعنی مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے معاہدات کی رُو سے پُر امن رہیں۔ اگر وہ عہد شکنی کرتے ہیں تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کردو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جنگ کے خوف سے، عہد شکنی سے باز آجائیں۔ لیکن اس کے برعکس، اگر اس کے معنی یہ کئے جائیں کہ اگر وہ اسلام لاکر مرتد ہوجائیں تو انھیں قتل کردو۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ارتداد سے باز رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ وہ مرتد ہوگئے۔ اس کے بعد انھیں قتل کردیا گیا۔ اب جسے قتل کردیا گیا ہو وہ ارتداد سے باز کس طرح آئیگا؟ وہ تو ختم ہوگیا۔

مودودی صاحب نے سورۂ توبہ کی اسی آیت پر اکتفا کردیا ہے۔ اگر وہ اس سے اگلی آیت بھی ساتھ ہی لکھ دیتے تو مطلب واضح ہوجاتا (لیکن ان کی منشاء کے خلاف جاتا)۔ وہ آیت یہ ہے:

الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدءوکم اول مرۃ اتخشونھم

فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مؤمنین۔ (۹/۱۳)

---

[1] واضح رہے کہ یہ لفظ اِیمان نہیں بلکہ اَیمان ہے۔ اَیمان، یمین کی جمع ہے اور اس کے معنی قسم یا معاہدے کے ہیں۔ اِیمان اس سے الگ لفظ ہے۔

کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے۔ جنھوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کئے اور پھر تمہارے برخلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمہارے دلوں میں ہو۔

یہ آیت اس سے پہلی آیت کی تشریح کر دیتی ہے (جسے مودودی صاحب نے نقل کیا ہے) اس میں مزید وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے اسباب و وجوہ کیا تھے۔ اس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ

(i) یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے قبل معاہدات کو توڑ چکے ہیں۔

(ii) رسول اللہؐ کو مکے سے نکال دینے کے منصوبے باندھ چکے ہیں۔

(iii) کئی بار تمہارے خلاف جنگ میں پہل کر چکے ہیں۔

یہ ہے وہ فردِ جرم جو قرآن نے ان لوگوں کے خلاف مرتب کی ہے آپ غور کیجئے کہ اس میں سیاسی معاہدات کے توڑنے کا ذکر ہے یا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو جانے کا ذکر؟ ان آیات میں کوئی قرینہ یا شائبہ بھی اس امر کا نہیں کہ ایمان کو کفر سے بدل دینے کو جرم قرار دے کر اس کی سزا موت تجویز کی جا رہی ہو۔

بہر حال یہ ہے وہ ثبوت جو مودودی صاحب نے "قتلِ مرتد" کے متعلق قرآن سے پیش کیا ہے۔ ان کی پیش کردہ آیت پر ایک مرتبہ پھر غور کرو (اس کے بعد ان تمام آیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لاؤ جو دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کے خلاف، سابقہ صفحات میں لکھی جا چکی ہیں) اور پھر سوچو کہ کیا اس آیت سے کسی طرح بھی قتلِ مرتد کا ثبوت بہم پہنچتا ہے؟ ثبوت بہم پہنچا تو ایک طرف، یہ سوچو کہ اس آیت کا اس موضوع (قتلِ مرتد) کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب نے یہ آیت محض تکلفاً لکھ دی ہے (جس طرح رسماً خط کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا نفسِ مضمون سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی لکھنے والے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ فی الواقعہ خط کا آغاز خدا کے نام سے کرتا ہے)۔ ورنہ وہ اپنے دل میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن نے کہیں مرتد کی سزا قتل تجویز نہیں کی۔ چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

قرآن نہیں، بلکہ روایات اور فقہ

> بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سن کر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کیلئے اگرچہ ہم نے اس بحث کی ابتدا میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات۔ خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں اور فقہاء کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کیلئے بالکل کافی تھیں۔ ثبوتِ حکم کے لئے ان چیزوں کو ناکافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا تمہاری رائے میں اسلام کا پورا قانونِ تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو گویا تم یہ کہتے ہو کہ قرآن میں جن افعال کو جرم قرار دیکر سزا تجویز کر دی گئی ہے ان کے ماسوا کوئی فعل اسلامی حکومت میں جرم مستلزمِ سزا نہ ہوگا۔ (صفحہ ۳۰-۳۱)

اب آئیے مولوی صاحب اپنے اصل موقف پر۔ قرآن کی آیت تو محض تبرکاً لکھدی گئی تھی حکم کے لئے حدیث دیکھئے۔ فقہ دیکھئے۔ (اور یہی وہ مقام ہیں جہاں "مزاج شناسی"[1] کی گنجائش نکلتی ہے)۔

یہ درست ہے کہ

(۱) قرآن میں ایسے جرائم کا بھی ذکر ہے جن کی سزا اس نے خود متعین نہیں کی۔ مثلاً خمر، میسرہ۔ وغیرہ

(۲) ایسے جرائم بھی ہیں جن کا قرآن میں محض اصولی حکم ہے۔ ان کی نوعیت متعین نہیں کی گئی۔ مثلاً نہی عن المنکر کا اصولی حکم۔

قرآن نے ارتداد کو جرم ہی قرار نہیں دیا

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے (اور بار بار کہتا ہے) کہ کفر اور ایمان کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا کسی حالت میں بھی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کفر اور ایمان کا بدلنا کوئی جرم نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ایمان کو کفر سے بدلنے کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو ایسا کرے گا وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے۔ تو کیا ایسا کہنے والا دین کے ضابطۂ تعزیرات کی تکمیل کر رہا ہے یا قرآن کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہے؟ اگر ایسا کہنے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں عربی زبان کے چار فقرے پیش کرکے انہیں حدیث۔ صحابہؓ کے فیصلے اور فقہاء کی رائے قرار دیدے تو اس کے قول کو محض اس لئے دین مان لیا جائے گا کہ اس نے عربی کے ان فقروں کی نسبت حضور رسالتمآبؐ، صحابہ کبارؓ اور ائمہ فقہ علیہم الرحمۃ کی طرف کردی ہے اور ایسا کرنے میں قطعاً نہیں شرمایا؟ ہم میں نہ آج رسول اللہ موجود ہیں نہ صحابہ کبارؓ اور نہ ہی ائمہ فقہ۔ ہم ان حضرات سے کس طرح تصدیق کریں کہ یہ ارشادات فی الواقعہ ان کے ہیں یا اُن کی طرف غلط منسوب کردیئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس، ہمارے پاس قرآن موجود ہے جس کے محفوظ ہونے کا دعوٰے خود اللہ نے کیا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اس نے لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کفر اور ایمان کی تبدیلی کوئی جرم نہیں۔ فرمایئے! ان حالات میں کس کی بات دین کہلائے گی۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی بات۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں ہماری بات۔ اس لئے کہ اگرچہ آج ہم میں رسول اللہؐ موجود نہیں لیکن میں رسول اللہؐ کا مزاج شناس[1] تم میں موجود ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ فلاں بات رسول اللہؐ نے فرمائی تھی یا نہیں۔ اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج رسول اللہؐ موجود ہوتے تو وہ اس باب میں کیا فرماتے؟ لہذا میری بات کو میری بات نہ سمجھو۔ اسے رسول اللہؐ کی بات سمجھو۔

کوئی اور بولتا ہے یہ میری زباں نہ سمجھو!

لا اکراہ فی الدین کی تفسیر

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ بیشک قرآن میں لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں) کا حکم موجود ہے لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں کر سکتے لیکن جو شخص ایک دفعہ مسلمان ہو جائے اسے اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جا سکتی کہ وہ اسلام کے حلقے سے باہر نکل جائے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے گا تو اسے قتل کردیا جائے گا۔ ان کا ارشاد ہے:

---

[1] "مزاج شناسی" کے لئے دیکھئے مضمون "مثلہٗ معہٗ" جو سالِ گذشتہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔

لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے واپس آکر جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کرکے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے۔ ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ (ص۵۳)

یعنی اسلام میں صرف (ONE WAY TRAFFIC) ہے۔ اس میں داخل ہونے تک تو تمہیں اختیار و ارادہ حاصل ہے لیکن اس کے بعد کفر اور ایمان کے معاملے میں وہ تمام اختیارات جو تمہیں خدا نے دیئے تھے، سب سلب ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد مودودی صاحب کے دعوے کی تمام دلیلیں گردش کرتی ہیں۔ یعنی وہی جواب جو قرآن کے بیان کے مطابق تمام کفار اپنے اپنے رسولوں کو دیا کرتے تھے۔

وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا۔ ۔ ۔ (۱۴/۱۳)

انکار کرنے والے سرکش اپنے رسولوں سے کہتے تھے کہ یا تو ہم تمہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیں گے یا اپنے مذہب میں واپس لے آئیں گے۔

یہی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے والے مسلمان کو یا تو ملک چھوڑ کر چلا جانا ہوگا اور یا پھر اسی مذہب میں واپس جانا۔ ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔

اگر کفر و ایمان کے بارے میں قرآن میں صرف وہی آیات ہوتیں جنھیں ہم پہلے لکھ آئے ہیں تو مسئلہ زیر نظر کے سمجھنے کے لئے وہی کافی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اسلام میں اس قسم کے فتنے بھی اٹھیں گے اس لئے اس نے اس مسئلہ کو یہیں نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اسلام لانے کے بعد پھر کافر ہو جانے والوں کے متعلق بھی، ایک نہیں، متعدد مقامات پر صراحت سے ذکر کر دیا۔ مودودی صاحب نے

مرتد کے متعلق قرآن کی تصریحات

اپنے رسالے میں ان مقامات کو چھوا تک نہیں اس لئے کہ لا یمسہ الا المطھرون۔ جن کے قلب و دماغ عجمیت کی کثافتوں سے آلودہ ہو چکے ہوں وہ قرآن کو کس طرح چھو سکتے ہیں؟ دیکھئے قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین (۳/۸۴)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا۔ اور آخرت میں وہ تباہ و نامراد ہوگا۔

یہ ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اسلام کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہدایت پانے کے بعد پھر کفر اختیار کر گئے ان کے متعلق ارشاد ہے:

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم وشھدوا ان الرسول حق وجاءھم البینٰت۔ واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین ۝ اولٰئک جزاءھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین ۝ خالدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون ۝ الا الذین تابوا من بعد ذالک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم (۳/۸۵-۸۹)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اس قوم کو ہدایت دیدے جس نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کرلی۔ حالانکہ اس نے گواہی دی تھی کہ اللہ کا رسول برحق ہے۔ اور اس کے سامنے روشن دلیلیں بھی آچکی تھیں۔ اللہ صحیح مقام سے ہٹ جانے والوں پر ہدایت کی راہیں نہیں کھولا کرتا۔

ان لوگوں کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی۔ فرشتوں کی اور انسانوں کی۔ سب کی۔ لعنت برس رہی ہے۔ اس حالت ہمیشہ رہیں گے۔ نہ تو ان کا عذاب کبھی کم ہوگا اور نہ کبھی مہلت پائیں گے۔

لیکن جن لوگوں نے اس حالت کے بعد بھی توبہ کرلی اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو بیشک اللہ بخشنے والا، رحمت والا ہے۔

یہ ہے ذکر ان لوگوں کا جو اسلام لانے کے بعد پھر کفر کی طرف پھر جائیں۔ آپ دیکھئے ان کے متعلق کہیں یہ نہیں لکھا کہ انھیں جرم ارتداد کی سزا میں قتل کردینا چاہئے[1]۔ ان کے متعلق صرف اتنا کہا ہے کہ اسلام کو چھوڑنے سے یہ ان تمام برکات وثمرات سے محروم ہوجائیں گے جو راہ راست پر چلنے کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسلام کی راہ، کامرانیوں اور شادکامیوں کی راہ ہے اور کفر کی راہ ناکامیوں اور تباہیوں کی راہ۔ یہ اسلام پر قائم رہتے تو کامران وکامیاب زندگی بسر کرتے۔ انھوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی تو ان کی کامیابیاں ناکامیوں میں بدل گئیں۔ اب اس کے بعد بھی کچھ نہیں بگڑا۔ جس طرح انھیں اس امر کا اختیار تھا کہ اسلام لانے کے بعد جی چاہے تو اس کے دائرے سے باہر نکل جائیں، اب بھی انھیں اختیار ہے کہ جی چاہے تو پھر اس کے حلقہ بگوش ہوجائیں۔ اگر انھوں نے پھر اسلام اختیار کرلیا تو اسلامی زندگی کی برکات وسعادتیں پھر ان کے شاملِ حال ہوں گی۔ غور کیجئے! اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو ان لوگوں کے پھرسے اسلام میں آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اس سے اگلی آیات میں ان لوگوں کے طبعی موت سے مرجانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفراً لن یقبل توبتھم واولئک ھم الضالون ۝ ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار فلن یقبل من احدھم ملء الارض ذھباً ولو افتدیٰ بہ۔ اولئک لھم عذاب الیم ومالھم من نصرین (۳ / ۹۰-۸۹)

جن لوگوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کرلیا اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی یہی لوگ ہیں جو راہ راست سے بھٹک گئے۔

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہے۔ تو اگر ان میں سے کوئی شخص پورا کرۂ ارض سونے سے بھر کر دیدے جب بھی اس کے فدیے میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

غور کیجئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام لانے کے بعد پھر۔۔۔ کفر کی راہ اختیار کرلی (مرتد ہوگئے) اور پھر اسی حالت کفر میں مرگئے

---

[1] مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن حال ہی میں شائع ہوئی ہے (جو سورۂ انعام تک ہے) اس میں سورۂ آل عمران کی ان آیات کی تفسیر میں مودودی صاحب نے کہیں نہیں لکھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔

(وماتوا وھم کفار) تو ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ دیکھئے! یہاں ان کے طبعی موت سے مرجانے کا ذکر صاف طور پر موجود ہے اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو نہ ان کے کفر میں بڑھتے جانے کا ذکر ہوتا (کیونکہ جسے قتل کر دیا جائے وہ کفر میں بڑھتا کیسے جائے گا! کفر میں اضافہ تو اسی وقت ہوگا جب مرتد ہونے کے بعد جیتا رہے) اور نہ ہی یہ لکھا ہوتا کہ وہ بحالتِ کفر مرجائیں گے۔ (ماتوا)۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالے میں ان آیات کا ذکر تک نہیں کیا۔ (نہ ہی تفہیم القرآن میں ان آیات کے ضمن میں قتلِ مرتد کا سوال اٹھایا ہے۔)

اب اور آگے بڑھیے۔ سورۂ نساء میں ہے:

ان الذین اٰمنوا ثم کفروا۔ ثم اٰمنوا ثم کفروا۔ ثم ازدادوا کفراً لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلاً (۴/۱۳۷)

جو لوگ ایمان لائے۔ اس کے بعد پھر کافر ہوگئے۔ پھر ایمان لائے۔ پھر کافر ہوگئے۔ اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ انھیں بخشنے والا نہیں۔ اور ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ انھیں ہدایت کی راہ دکھائے۔

یعنی یہاں صرف ایک مرتبہ مرتد ہوجانے کا ذکر نہیں، دوبار ارتداد کا ذکر ہے۔ اسلام لائے۔ پھر مرتد ہوگئے۔ پھر اسلام لائے پھر مرتد ہوگئے۔[1] اور اس کے بعد اسلام نہیں لائے بلکہ حالتِ کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ ان کی بخشش نہیں ہوگی۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کی رو سے اسلام اور کفر کے دروازے کس طرح آمد و رفت کیلئے کھلے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور اسی کے خلاف مودودی صاحب کا فرمان ہے کہ

> جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں۔ لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔

اسلام سے "واپس جانے والا" کہتا ہے کہ دیکھو! خدا نے یہ دروازہ کھلا رکھا ہے اس لئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کون ہوتا ہے جو اس دروازے کو کھلا رکھ سکے۔ ان دروازوں کو روایات نے بند کیا ہے۔ فقہ نے بند کیا ہے۔ اور اب ان پر ہمارا پہرہ ہے۔ خدا نے کھولا تھا لیکن ہم انھیں بند کرتے ہیں۔ اب دیکھیں خدا انھیں کس طرح کھول سکتا ہے۔

ایک آیت اور دیکھئے جس میں "ارتداد" کا خصوصی ذکر ہے۔ فرمایا:

یا یھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ ۔ ۔ ۔ الخ (۵/۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی مرتد ہو جائے[2] تو (ایسے لوگوں کی جگہ) خدا ایک ایسی قوم پیدا کر دے گا جنھیں خدا دوست رکھے گا اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہے عطا کرے۔ اللہ اپنے فضل میں بڑی وسعت والا، علم والا ہے۔

---

[1] مودودی صاحب تفہیم القرآن میں اس آیت کو بھی گول کر گئے ہیں۔

[2] مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں اس آیت کے تحت بھی یہ نہیں لکھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ وہاں بھی چپکے سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

دیکھئے بات کس قدر صاف ہے! اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جو کوئی مرتد ہوتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے لوگوں کی جگہ ہم ایسی قوم لے آئیں گے جو صحیح مومنانہ صفات کے پیکر ہوں گے۔ اس آیت میں بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان لوگوں کو قتل کردو۔ قتل کرنا تو ایک طرف رسول اللہ سے تو یہاں تک فرمادیا کہ اگر یہ ایسا کرتے ہیں تو کرنے دو۔ تمہیں ان پر پاسباں بنا کر تھوڑا ہی بھیجا گیا ہے۔ ومن تولیٰ فما ارسلناک علیھم حفیظا (۴/۸۰) "جو کوئی اطاعت سے پھر جائے تو اے رسول! ہم نے تمہیں ان پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا"۔

اب سورۂ نحل کی ان آیات کو دیکھئے جن کا ایک حصہ پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہے:

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم (۱۶/۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے کفر کرتا ہے۔ وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہاں صراحت سے مرتد کا ذکر ہے اور ایسے مرتد کا جو جبر واکراہ سے نہیں بلکہ اپنے دل کی کشادگی سے کفر اختیار کرتا ہے۔ قرآن نے کہیں نہیں لکھا کہ اس کی سزا موت ہے۔ اسے تیغ کے گھاٹ اتار دو۔ اس سے اگلی آیت میں اس کی وجہ بیان کی ہے۔ فرمایا:

ذالک بانھم استحبوا الحیوٰۃ الدنیا علی الاٰخرۃ وان اللہ لا یھدی القوم الکافرین (۱۶/۱۰۷)

یہ اس لئے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کافروں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔

یہ تھی وہ وجہ جس سے انھوں نے اسلام چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے مستقبل کی کامرانیوں کی بجائے پیش پا افتادہ مفاد کے حصول کو ترجیح دی۔ اور یہ اسلئے کیا کہ ان میں دوراندیشی اور عاقبت بینی کا مادہ نہیں رہا۔

اولٰئک الذین طبع اللہ علیٰ قلوبھم وسمعھم وابصارھم واولٰئک ھم الغافلون (۱۶/۱۰۸)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی اور یہ لوگ غفلت میں ڈوب گئے۔

ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟

لاجرم انھم فی الاٰخرۃ ھم الخاسرون (۱۶/۱۰۹)

لامحالہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں تباہ حال ہوں گے۔

قرآن کا واضح فیصلہ

غور کیجئے۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردن ماردی جائے گی اور اس طرح انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام لاکر پھر کفر اختیار کرنے کی سزا کیا ہے؟ قرآن کا فیصلہ واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شروع میں بھی اسلام سے انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن میں صحیح بصیرت نہیں ہوتی۔ ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم (۲/۶-۷)

"وہ لوگ جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، تم انھیں (ان کی اس روش کے نتائج سے) آگاہ کرو یا نہ کرو۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔" اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حالت ایسی ہی کرلی ان کا بھی یہی حشر ہوگا (ولھم عذاب عظیم ۱۰۶/۱۶) آپ نے دیکھا کہ اس باب میں قرآن نے شروع میں اسلام سے انکار کرنے والوں اور اسلام لاکر اس سے پھر جانے والوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ کہتا ہے کہ دونوں کے انکار کی علت ایک ہی ہے۔ یعنی طبع اللہ علیٰ قلوبھم۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں نے اپنی عقل و بصیرت کھو دی ہے اور اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اس لئے عقل و دانش کو مفلوج کرکے نہ تو پہلی بار اسلام قبول کرایا جاسکتا ہے نہ ہی ان لوگوں کو اسلام میں بالجبر رکھا جاسکتا ہے جو عقل و دانش سے یکسر محروم ہو چکے ہوں۔ اور اس طرح انھوں نے اسلام چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ جب علت دونوں کی ایک ہے تو پھر ان دونوں سے سلوک میں فرق کیسا؟ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! اللہ میاں کو (معاذ اللہ) اس کا پتہ نہیں۔ ان میں بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے اول الذکر گروہ کو تو جینے کا حق دیا جاسکتا ہے لیکن ثانی الذکر کو یہ حق قطعاً نہیں دیا جاسکتا۔ اسے گولی ماردینی چاہئے!

بہرحال یہ ہیں قرآن کی وہ آیات جن کا ذکر تک مودودی صاحب نے اپنے مقالہ میں نہیں کیا! اور جن سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ارتداد کوئی جرم نہیں۔ اب پھر مودودی صاحب کی اس دلیل پر غور کیجئے جس میں وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن میں جرم ارتداد کی سزا نہیں لکھی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی سزا ہی مقرر نہ کی جائے۔ اس کی سزا روایات اور فقہ نے متعین کردی ہے۔ لیکن جو آیات اوپر لکھی جاچکی ہیں ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مرتد کے معاملے میں قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اسلام کے بعد کفر اختیار کرلینا کوئی جرم نہیں۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ مسلمان رہے یا اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلے۔ اس لئے جب یہ چیز جرم ہی نہیں تو اس کی سزا کیسی؟ بنا بریں بات یوں ٹھہری کہ

ارتداد جرم ہی نہیں لہذا سزا کیسی؟

(۱) قرآن نہ تو ارتداد کو جرم قرار دیتا ہے اور (اس لئے) نہ اس کی کوئی سزا تجویز کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلے۔

لیکن (۲) اس کے برعکس، احادیث اور فقہ، ارتداد کو جرم قرار دیتی ہیں اور اس کی سزا موت بتاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کس کا فیصلہ صحیح مانا جائے۔

(الف) مُلا (اور اس گروہ کے ترجمان مودودی صاحب) کا فتویٰ ہے کہ حکم روایات اور فقہ کا مانا جائے۔ اور

(ب) ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ فیصلہ قرآن ہی کا فیصلہ ہے اور حکم اللہ ہی کا حکم ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئٰک ھم الکافرون۔ (جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے)۔

باقی رہا روایات کا اور فقہ کا معاملہ سو

(ج) ہمارے نزدیک نہ رسول اللہ کوئی ایسا حکم دے سکتے تھے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہو اور نہ ہی ائمہ فقہ کے

متعلق ایسا خیال کرتے ہیں اس لئے یہ چیزیں وضعی اور بعد کی اختراع ہیں۔ انھیں رسول اللہ یا ائمہ فقہ کی طرف منسوب کرنا بڑی جرأت اور گستاخی ہے۔

تواتر کی سند

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں:

اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لئے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد تو زمانہ گذشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایتہً پہنچی ہے شک سے محفوظ نہیں رہتی۔ (ص۵)

اس کے متعلق ہماری گذارش یہ ہے کہ معاملہ ایک دو مسائل تک جائے یا ہزار دو ہزار تک، اصول ہر جگہ ایک ہی ہونا چاہئیے یعنی جو بات قرآن کے خلاف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ہم تک صرف قرآن محفوظ پہنچا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ اس نے نہیں لیا۔ اگر ہمارے پاس قرآن محفوظ شکل میں نہ ہوتا تو ہمیں بھی مجبوراً "تسلسل اور تواتر" کا محتاج ہونا پڑتا جس طرح دنیا کے دیگر اہل کتاب کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن جب ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے تو تسلسل اور تواتر کا معیار اللہ کی کتاب ہوگی نہ کہ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال کر، ہمارا عمل تسلسل اور تواتر پر ہوگا؛ اگر دین کے لئے تسلسل اور تواتر ہی کو معیار بننا تھا تو قرآن کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ بہرحال یہ ہیں دو مسلک جو بالکل کھلے اور واضح ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر تسلسل اور تواتر کو دین ماننے کا مسلک مودودی صاحب (اور تمام مولویوں) کا مسلک ہے۔ اور تسلسل اور تواتر کو کتاب اللہ کے تابع رکھنے کا مسلک ہمارا مسلک ہے۔

مودودی صاحب کے نزدیک ان کا مسلک عین اسلام کا مسلک ہے اور ہمارا مسلک کفر کا مسلک! اور چونکہ مسلمان ہونے کے بعد "کفر کا مسلک" ارتداد ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے اس لئے ہماری سزا موت ہے۔

احادیث اور قتلِ مرتد

قرآن کی اس "دلیل" کے بعد مودودی صاحب نے احادیث کی رُو سے قتلِ مرتد کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس باب میں ہمیں کسی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قرآن کے ایسے واضح احکام کے بعد کوئی چیز جو قرآن کے خلاف جاتی ہو اس قابل نہیں ہو سکتی کہ اسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔ یوں بھی روایات سے کیا کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا! جس مقصد کے لئے ہم نے اس حصے کا ضمنی ذکر چھیڑا ہے وہ کچھ اور ہے۔ عام طور پر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اس چیز کی کوئی بین مثال پیش کرنی چاہئیے کہ روایات میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو قرآن کی تعلیم کے صریح خلاف جاتی ہیں۔ اس کی مثال مودودی صاحب کی پیش کردہ احادیث سے مل سکے گی۔ ان احادیث میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

کسی مسلمان کا خون حلال نہیں الا یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کی ہو۔ یا مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو۔ یا کسی کی جان لی ہو۔ (ص۱۲)

اس حدیث میں تین باتوں میں سے دو باتیں ایسی ہیں جو قرآن کے احکام کے یکسر خلاف ہیں۔ ایک تو قتلِ مرتد جس کے متعلق قرآنی آیات سابقہ صفحات میں آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں۔ دوسرے زانی کا قتل (رجم یا سنگسار) قرآن نے زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو سو دُرّے مقرر کی ہے۔ بالکل واضح اور صریح الفاظ ہیں۔ اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا کوئی فرق نہیں لیکن روایات میں شادی شدہ زانی کی سزا رجم (سنگسار) لکھی ہے۔ یعنی قرآن کچھ سزا مقرر کرتا ہے اور روایات اس کے بالکل برعکس دوسری سزا بتاتی ہیں۔ جب یہ اعتراض سامنے آیا کہ روایات کی یہ سزا قرآن کے صریحاً خلاف ہے تو اس الزام سے بچنے کے لئے اور روایات وضع کرلی گئیں جن میں یہ لکھ دیا گیا کہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن میں آیۂ رجم موجود تھی اور ہم اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اب قرآن میں وہ آیت موجود نہیں لیکن اس کا حکم بدستور موجود ہے[1]۔ یعنی ایک جھوٹ کو سچا ثابت کرنے کے لئے دس جھوٹ اور وضع کئے گئے اور اس میں اتنا بھی خیال نہ رہا (یا شاید دانستہ ایسا کیا گیا) کہ اس سے حفاظتِ قرآن کا دعویٰ ہی یکسر باطل ہوجاتا ہے جس پر اسلام کا دارومدار ہے۔ لیکن مُلّا کو اس سے کیا غرض کہ قرآن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے! اس کا دین روایات پرستی ہے۔ وہ پرستش ہی اشخاص کی کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معبودوں کی سلامتی چاہتا ہے خواہ اس میں خدا باقی رہے یا نہ رہے۔

ایک دلچسپ حدیث احادیث کے ضمن میں مودودی صاحب نے ایک ایسی دلچسپ روایت نقل کی ہے جسے درج کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ عبداللہ بن ابی سرح کسی زمانے میں رسول اللہؐ کا کاتب تھا۔ پھر شیطان نے اسے پھسلا دیا اور وہ کفار سے جا ملا۔ اس کی بابت حدیث میں ہے:

> جب مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے عثمان بن عفانؓ کے دامن میں پناہ لی۔ عثمانؓ اس کو لیکر نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اس کی بیعت قبول فرما لیجئے۔ حضورؐ نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا اور چپ رہے۔ تین دفعہ یہی ہوا۔ آپ اس کی طرف بس دیکھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ آخر تین دفعہ کے بعد آپ نے اس کو بیعت میں لے لیا۔ پھر آپ صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہارے اندر کوئی ایسا بھلا آدمی موجود نہ تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک رکھا ہے تو آگے بڑھتا اور اس شخص کو قتل کر دیتا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے آنکھ سے اشارہ کیوں نہ فرما دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ایک نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ آنکھوں کی چوری کرے۔ (صفحہ ۱۷-۱۶)

آپ نے غور فرمایا کہ دربارِ رسالتمآبؐ کا یہ کس قسم کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ ایک شخص مجرم ہے اور رسول اللہؐ کے نزدیک واجب القتل۔ حضرت عثمانؓ اس کی سفارش فرماتے ہیں۔ رسول اللہؐ میں (معاذ اللہ معاذ اللہ) اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ یا اسے علانیہ معاف کر دیں اور یا قتل کا حکم دیدیں۔ ہر بار نگاہ اٹھاتے ہیں اور خاموش رہ جاتے ہیں۔ پھر مجبوراً معاف کر دیتے ہیں اور پھر صحابہ کو ملامت کرتے

[1] طلوع اسلام میں اس موضوع پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

ہیں کہ کیا ان میں "کوئی ایک بھی بھلا آدمی ایسا نہ تھا" جو رسول اللہؐ کے اس خفیہ اشارہ (یعنی خاموشی) کو بھانپ کر اس مجرم کو قتل کر دیتا!

صدمہ اس کا نہیں کہ عجم کے منافقین نے روایات سازی سے نبی اکرمؐ کی سیرت کو کس طرح مسخ کر دیا۔ صدمہ اس کا ہے کہ آج ہمارا مُلّا کس طمطراق سے ان روایات کو "دین" بنا کر پیش کئے جا رہا ہے۔ اگر وہ دانستہ ایسا کرتا ہے تو وہ خود اس سازش میں شریک ہے۔ اور اگر نادانستہ ایسا کرتا ہے تو اس کی جہالت پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن منافقت ہو یا جہالت، نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ دنیا انہی باتوں کو مستند قرار دیکر اچھال رہی ہے اور اسلام کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

آثارِ صحابہؓ

روایات کے بعد مودودی صاحب نے آثارِ صحابہؓ سے بھی بعض مثالیں قتل مرتد کی تائید میں پیش کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک گروہ مسلمان ہو کر پھر عیسائی ہو گیا اس پر

> حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیئے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لئے گئے (ص۲۱)

مذہب بدلنے والوں کو قتل کر دینا اور اس کے بال بچوں کو غلام بنا لینا! یہ ہے اسلام؟

اور آگے بڑھئے۔ لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ کچھ لوگ آپ کو رب قرار دے رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے انھیں سمجھایا لیکن وہ اپنے اس عقیدے سے باز نہ آئے۔

> آخر کار حضرت علیؓ نے ایک گڑھا کھدوایا۔ اس میں آگ جلوائی۔ پھر ان سے کہا، دیکھو اب بھی اپنے قول سے باز آجاؤ۔ ورنہ تمہیں اس گڑھے میں پھینک دوں گا۔ مگر وہ اپنے اسی عقیدے پر قائم رہے۔ تب حضرت علیؓ کے حکم سے وہ سب اسی گڑھے میں پھینک دیئے گئے۔ (ص۲۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں ایک بت بنا رکھا تھا اور اس کی پرستش کرتے تھے۔

> یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علیؓ نے اس گھر میں آگ لگادی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (ص۲۲)

یہ ہیں آپ کی "خلافتِ راشدہ" کے وہ کارنامے جو عجمی سازش کے صدقے آپ کی کتب روایات میں درج ہو چکے ہیں اور جنہیں آج مزاج شناسِ اسلام، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، اس فخر سے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور ان سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ خدا اسلام کو ایسے دوستوں سے بچائے!

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو تبلیغ کا حق؟

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ

> کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق اسی طرح حاصل ہو گا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

اس کے جواب میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

اس مسئلہ کا فیصلہ بڑی حد تک تو قتل مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے۔ کیونکہ جب ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا حق نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم حدودِ اسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کے اٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دوسرے مذاہب و مسالک کو تبلیغ کا حق دینا اور مسلمانوں کے لئے تبدیلِ مذہب کو جرم ٹھہرانا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور موخر الذکر قانون مقدم الذکر چیز کو خود بخود کالعدم کر دیتا ہے۔ لہٰذا قتلِ مرتد کا قانون فی نفسہٖ یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام اپنے حدودِ اقتدار میں تبلیغ کفر کا روادار نہیں۔ (صفحہ ۳۲-۳۳)

چونکہ یہ مسئلہ بہت اہم تھا کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق دیا جائے گا یا نہیں۔ اس لئے آپ نے اس سوال کے جواب میں تفصیلی بحث کی ہے اور اس بحث سے وہی کچھ ثابت کیا ہے جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ بحث کے اخیر پر آپ پھر لکھتے ہیں کہ

اس میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک ہمیں ایسا نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو آ کر اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت دے سکتی ہے جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔ اب اگر بعد کے (یعنی خلافتِ راشدہ کے بعد کے) دنیا پرست "خلفاء" اور بادشاہوں نے اس کے خلاف کوئی عمل کیا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اسلام کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ وہ دراصل اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ایک حقیقی اسلامی حکومت کے فرائض سے ناواقف تھے، یا ان سے منحرف ہو چکے تھے ...... اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کارنامے ان بادشاہوں کے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ (صفحہ ۴۰-۴۱)

اقتباسات بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک:

(i) اسلام اپنے حدود اقتدار میں کفر کی تبلیغ کا روادار نہیں۔

(ii) اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔

(iii) اگر کسی نے غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دی ہے تو اس کا یہ فعل اسلام کے خلاف تھا اور اسلام کی عدالت میں جرم۔

ایک ملتی جلتی بات

آپ کو شاید معلوم ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ بھی اسلام کا حکم ہے (اور "اسلامی حکومت" کا فریضہ) کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بنایا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر بے حد و بے شمار (جتنی جی چاہیں) گھروں میں ڈال لیا جائے۔ اس پر کسی نے یہ اعتراض کیا کہ اگر یہی روش دوسری قومیں بھی اختیار کر لیں اور مسلمانوں کی

بہو بیٹیوں، ماؤں، بہنوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک ہونے لگے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ لیکن "اسلامی جماعت" اور اس کے امیر کو ... کیا غرض کہ وہ سوچیں کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو اور عصمت و ناموس سے کیا بنتی ہے؟ اگلے دنوں (کسی یاترا کے سلسلے میں) ایک سکھ ہندوستان سے پاکستان آیا تھا۔ اغوا شدہ عورتوں کے سلسلے میں، اس کے ایک جاننے والے مسلمان نے اس سے بات چیت کی اور کہا کہ کیا تم لوگوں کو ... ذرا خیال نہیں آتا کہ دوسروں کی عورتوں کو اس طرح گھروں میں ڈال لینا شریفوں کا کام نہیں! سکھ نے کہا کہ ہم تو اس فعل کو شروع ہی سے خلاف انسانیت سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں نے یہ بتا کر کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانا عینِ اسلام ہے، ہمیں بھی اس کی جرأت دلا دی۔ اگر یہ فعل عین اسلام کے مطابق ہے تو ہمیں ایک اسلامی کام سے کیوں روکا جاتا ہے؟

اسی قسم کا یہ دوسرا فتویٰ بارگاہِ امارت مآب سے صادر ہوا ہے کہ اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ جب یہی قانون دوسری سلطنتیں اپنے ہاں رائج کر لیں گی تو پھر مسلمان چیخیں گے!

بہرحال، اب قتل مرتد کے سلسلے میں آگے بڑھئے۔

قتلِ مرتد کی عقلی دلیلیں

ان نقلی شہادات کے بعد، مودودی صاحب نے "قتل مرتد پر عقلی بحث" کی ہے۔ یہ حصہ مقالہ کے پہلے حصے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اسلئے کہ ــ مُلا اور عقلی بحث ــ نتیجہ ظاہر ہے۔ مودودی صاحب نے سب سے پہلے ان اعتراضات کو خود ہی نقل کر دیا ہے جو ان کے نزدیک قتل مرتد کے خلاف عقلاً وارد ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں کہ "قتل مرتد پر زیادہ سے زیادہ جو اعتراضات ممکن ہیں وہ یہ ہیں۔

اولاً یہ چیز آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے۔ ہر انسان کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ جس چیز پر اس کا قلب مطمئن ہو اسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اسے قبول نہ کرے۔ یہ آزادی جس طرح ایک مسلک کو ابتداءً قبول کرتے یا نہ کرنے کے معاملے میں ہر آدمی کو ملنی چاہئے اسی طرح ایک مسلک کو قبول کرنے کے بعد اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کے معاملے میں بھی حاصل ہونی چاہئے . . . . . .

ثانیاً۔ جو رائے اس طرح جبراً بدل جائے یا جس رائے پر سزائے موت کے خوف سے لوگ قائم رہیں تو وہ بہرحال ایماندارانہ رائے تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت محض ایک منافقانہ اظہار رائے کی ہوگی . . . . جو شخص اندر سے کافر ہو چکا ہو اگر سزائے موت سے بچنے کے لئے منافقانہ طریقے سے بظاہر مسلمان بنا رہے تو اس کا فائدہ کیا ہے؟

ثالثاً۔ اگر اس قاعدے کو تسلیم کر لیا جائے کہ ایک مذہب ان تمام لوگوں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے جو ایک مرتبہ اس کے حلقۂ اتباع میں داخل ہو چکے ہوں اور اس کے لئے اپنے دائرے سے نکلنے والوں کو سزائے موت دینا جائز ہے تو اس سے تمام مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

رابعاً۔ اس معاملے میں اسلام نے بالکل ایک متناقض رویہ اختیار کر لیا ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں ..... دوسری طرف وہ خود ہی اس شخص کو سزائے موت کی دھمکی دیتا ہے جو اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جانے کا ارادہ کرے۔

ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے مودودی صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ "اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ

اعتراضات کا جواب

ایک پورا نظامِ زندگی ہے۔" "ایمان ایک ایسی رائے نہیں" جو صرف انفرادی طور پر ایک شخص اختیار کرتا ہو بلکہ یہ وہ رائے ہے جس کی بنا پر انسانوں کی ایک جماعت تمدن کے پورے نظام کو ایک خاص شکل پر قائم کرتی ہے اور اسے چلانے کے لئے وجود میں لاتی ہے۔" مودودی صاحب کے جوابات کی ساری عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے۔ یعنی اسلام ایک اسٹیٹ (STATE) ہے، لہٰذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ ایک اسٹیٹ کا اس باب میں کیا رویہ ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد مودودی صاحب کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ یہ بات آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے کہ جس بات پر کسی شخص کا قلب مطمئن نہ ہو اسے اس کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں؛

> مرتد کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم جس بنیاد پر رکھی گئی ہے اس کو وہ نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لئے اس بنیاد کو ناقابلِ قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔[1] مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں۔ یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقعہ دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لا یموت فیھا ولا یحییٰ کی حالت میں مبتلا رہے۔ وہ اس حالت میں سوسائٹی کیلئے اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے ..... اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔ (ص۵۱)

اس جواب کا تجزیہ

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جس شخص کے نزدیک وہ بنیاد قابلِ قبول نہیں جس پر اسلامی اسٹیٹ اور سوسائٹی کی عمارت استوار ہوتی ہے، اس کے لئے صرف تین صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

---

[1] حرفاً حرفاً وہی بات جو کفار اپنے رسولوں سے کہتے تھے کہ لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا۔ یا پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ یا ملک چھوڑ کر چلے جاؤ۔ قرآن اس روش کو کفار کی روش بتاتا ہے اور مودودی صاحب اسے عینِ اسلام قرار دیتے ہیں!

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

(i) یا تو وہ اسلامی مملکت کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔

(ii) اسلامی مملکت میں رکھا جائے تو تمام حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے۔ یا

(iii) قتل کر دیا جائے۔

اس کے بعد مودودی صاحب شق ii اور iii میں خود ہی موازنہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رکھنے کا عذاب زیادہ شدید ہے اس لئے "تقاضائے ہمدردی" یہی ہے کہ اسے مار دیا جائے۔ تپ دق سے پھانسی ہزار درجے اچھی۔

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک یہ صورت ممکن ہی نہیں کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کی بنیادوں پر یقین نہیں رکھتا اسے اسلامی مملکت میں حقوقِ شہریت دیکر زندہ رہنے کی اجازت دی جائے! اسے یا تو مملکت چھوڑ جانا ہوگا یا تلوار کے گھاٹ اتر جانا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے لئے۔ یعنی ان کے لئے جو ان بنیادوں کو نہیں مانتے جن پر اسلامی سوسائٹی متشکل ہوتی ہے (بالفاظ دیگر جو ایمان نہیں رکھتے) ایسی صورت ممکن ہی نہیں کہ انھیں حقوق شہریت دیکر زندہ رہنے دیا جائے؟ اسلامی

ذمیوں کے حقوق

تصورِ مملکت میں ایک لفظ ذمی بھی ہے۔ ذمی وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی مملکت میں غیر مسلموں ہی کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب اسی مقالہ میں فرماتے ہیں:

> اس معاملے میں (ذمیوں کے معاملے میں) اسلام نے جتنی رواداری برتی ہے دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی دوسرے نظام نے نہیں برتی۔ دوسرے جتنے نظام ہیں وہ اساسی اختلاف رکھنے والوں کو یا تو زبردستی اپنے اصولوں کا پابند بناتے ہیں یا انھیں بالکل فنا کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسلام ہی ہے جو ایسے لوگوں کو ذمی بنا کر اور انھیں زیادہ سے زیادہ ممکن آزادیٔ عمل دیکر اپنے حدود میں جگہ دیتا ہے اور ان کے بہت سے ایسے اعمال کو برداشت کرتا ہے جو براہ راست اسلامی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی اساس سے متصادم ہوتے ہیں۔ (ص ۴۹)

آپ یقیناً تعجب سے پوچھیں گے کہ جب خود مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی مملکت میں ایسے لوگوں کے لئے گنجائش موجود ہے جو اس کے اساسی تصورات کو قبول نہیں کرتے۔ تو جو مسلمان' اسلام چھوڑتا ہے اس کی بھی تو یہی حیثیت ہے کہ وہ اسلام کے اساسی تصورات کو ناقابلِ قبول سمجھتا ہے۔ پھر ایسے شخص کے لئے اسلامی مملکت میں گنجائش کیوں نہیں؟

کافر اور مرتد کا فرق

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص شروع ہی سے کافر ہے اس میں اور جو شخص ایک دفعہ مسلمان ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹتا ہے' اس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر کے لئے اسلامی مملکت میں آزادیٔ عمل عقیدہ سے جینے کی گنجائش ہے۔ گنجائش ہی نہیں بلکہ اس کے لئے اسلامی مملکت بڑی مراعات دیتی ہے۔ لیکن جو مسلمان ان ذمیوں میں شامل ہونا چاہے اس کیلئے پھانسی کے تختے کے سوا کوئی اور جگہ نہیں۔ اب اس تفریق و تمیز کی وجہات سنئے

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ

(ذمیوں کے ساتھ) اس رواداری کی وجہ یہ ہے کہ اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے۔ وہ خدا کے بندوں سے آخر وقت تک یہ امید وابستہ رکھتا ہے کہ جب انھیں دینِ حق کے ماتحت رہ کر اس کی نعمتوں اور برکتوں کے مشاہدہ کا موقع ملے گا تو وہ بالآخر اس حق کو قبول کرلیں گے جس کی روشنی فی الحال انھیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ (ص۵)

گویا ایک ہندو کی فطرت تو انسانی فطرت ہے جس سے اسلام مایوس نہیں ہوتا لیکن اگر ایک مسلمان کسی غلط فہمی، غلط نگہی یا اور سبب سے ہندو ہوجاتا ہے تو اس سے اسلام مایوس ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی فطرت انسانی فطرت نہیں رہتی۔ کچھ اور بن جاتی ہے۔ وہ "خدا کے بندوں" سے آخر وقت تک نیک امید وابستہ رکھتا ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان عیسائی ہوجائے تو وہ اس سے کوئی نیک امید وابستہ نہیں رکھتا کیونکہ وہ "خدا کا بندہ" نہیں رہتا! یعنی مودودی صاحب کے نزدیک جو مسلمان ایک مرتبہ مذہب تبدیل کرلے، اس میں پھر اصلاح کا امکان قطعاً نہیں رہتا اس لئے اس کا علاج قتل کے سوا کچھ اور نہیں۔ حالانکہ وہ اس روایت کو بھی خود ہی نقل کرتے ہیں کہ

عمرو بن عاص حاکم مصر نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا پھر کافر ہوگیا۔ پھر اسلام لایا پھر کافر ہوگیا۔ یہ فعل وہ کئی مرتبہ کرچکا ہے۔ اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہ۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کئے جاؤ۔ اس کے سامنے اسلام پیش کرو۔ مان لے تو چھوڑ دو۔ ورنہ گردن ماردو۔ (ص۵۱)

یعنی حضرت عمرؓ کا فیصلہ تو یہ تھا کہ وہ ہزار بار بھی کافر ہوجائے تو بھی اس سے مایوس نہ ہو۔ لیکن ہمارے دورِ حاضر کے امیر المومنین ہیں کہ ان کی رائے میں جو مسلمان ایک مرتبہ بھی کفر اختیار کرلے اس سے تمام امیدیں منقطع ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا اس کا علاج موت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس قسم کی روش کو جس کی اجازت حضرت عمرؓ نے دی تھی، کھلنڈرے پن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ

ہم ایسے لوگوں کیلئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کردینا چاہتے ہیں جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں ....

کسی نظامِ زندگی کی تعمیر ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو جماعت اس کام کے لئے اٹھے اس میں لہری طبیعت کے کھلنڈرے لوگوں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ (ص۵۱)

غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ "ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم آمنوا ثم کفروا" کہہ کر اس امکان کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک شخص مرتد ہوکر پھر بھی اسلام لاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کی تاکید کرتے ہیں کہ مرتد کے لئے اسلام کا دروازہ ہر بار کھلا رہنا چاہیئے لیکن یہ ہمارے "مزاج شناسِ خدا ورسول" ہیں کہ ان کے نزدیک یہ عمل کھلنڈرا پن ہے جس کی اجازت اسلام میں قطعاً نہیں دی جاسکتی۔

کافر اور مرتد میں تفریق کی پہلی وجہ آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ یعنی کافر سے خدا مایوس نہیں ہوتا اسلئے اسے جملہ حقوقِ شہریت دیکر زندہ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جو مسلمان کفر اختیار کرے اس سے خدا مایوس ہوجاتا ہے اس لئے اس کا فوراً خاتمہ کردینا چاہیئے۔

اب اس کی دوسری وجہ سنئے۔ فرماتے ہیں

نہ ملنے والے (کافر) اور مل کر الگ ہوجانے والے (مرتد) کے درمیان انسانی فطرت لازماً فرق کرتی ہے۔ نہ ملنا، تلخی، نفرت اور

عداوت کو مستلزم نہیں ہے مگر مل کر الگ ہو جانا قریب قریب سو فیصدی حالات میں ان جذبات کو مستلزم ہے۔ (ص۶۲)

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ اگر مل کر الگ ہو جانے والے (مرتد) کی حالت یہی ہوتی ہے تو اس کیلئے توبہ کا دروازہ کیوں کھلا رکھا جاتا ہے؟ جب "قریب قریب سو فیصدی حالات میں ایسے شخص کا سینہ تلخی، نفرت اور عداوت کے جذبات سے لبریز ہوتا ہے تو اسے پھر سے اپنے اندر شامل ہو جانے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟

پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہر انسان کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ جس چیز پر اس کا قلب مطمئن ہو اسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اسے قبول نہ کرے۔ اس میں کافر اور مرتد کی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا جواب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کافر اور مرتد میں کیوں فرق کیا جانا ضروری ہے!

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح باندھ کر (موت کی سزا کے ڈر سے) مسلمان رکھنے سے وہ شخص منافقانہ انداز زندگی بسر کرے گا جس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کا جواب پہلے لکھا جا چکا ہے، لیکن مزید وضاحت کے لئے اس کا دہرا دینا ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

> قتل مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ در اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کیلئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور جن کی رائے اور سیرت میں وہ استحکام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو ایک نظام زندگی کی تعمیر کیلئے مطلوب ہوتا ہے۔ (ص۵۱)

آپ اندر آنے کا دروازہ تو نہیں بند کر رہے۔ آپ تو باہر جانے کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ اس دروازے کے بند کر دینے کے بعد، جو لوگ موت کے ڈر سے مسلمان بن کر رہیں گے، وہ اگر منافقت کی زندگی بسر نہیں کرینگے تو اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ آپ اپنی جماعت کے اندر آنے کا راستہ ان لوگوں کیلئے بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں۔ تو جس طرح اسلام سے کفر کی طرف جانا تلون مزاجی کی نشانی ہے اسی دلیل سے کفر سے اسلام کی طرف آنا بھی تو تلون مزاجی ہے۔ آپ کی اس دلیل کے مطابق تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) تمام صحابہؓ تلون مزاج تھے جو اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے برعکس رائے اور سیرت کے استحکام کے پیکر (پناہ بخدا) ابو جہل اور ابو لہب تھے جو مرتے مر گئے لیکن اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا! حضرت! سوچئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

تیسرے اعتراض کا جواب

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر اسلام اپنے حلقے سے باہر نکلنے والوں کو سزائے موت دیتا ہے تو اگر یہ اصول ہر مذہب نے اپنے ہاں تسلیم اور رائج کر لیا تو اس سے ہر مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہے:

اس اعتراض کی بنیاد بھی غلط ہے معترضین کے پیشِ نظر دراصل ان "مذاہب" کا اور انہی کے پرچار کا معاملہ ہے جن کی تعریف ہم ابتدا میں کرچکے ہیں۔ ایسے مذاہب کو واقعی اپنا دروازہ آنے اور جانے والوں کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ وہ اگر جانے والوں کیلئے بند کرینگے تو ایک بے جا حرکت کریں گے۔ لیکن جس مذہب میں فکر و عمل پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر کی گئی ہو اسے کوئی آدمی جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی تخریب اور اپنے اجزائے تعمیر کے انتشار اور اپنی بندش وجود کی برہمی کا دروازہ خود ہی کھلا رکھے۔ (ص۵۲)

بالکل بجا! اسے یہی مشورہ دینا چاہئے کہ وہ ان تمام عناصر کو جو اس اسٹیٹ اور سوسائٹی کے بنیادی اصولوں سے منحرف ہو چلے ہوں، زبردستی باندھ کر اور موت کا خوف دلا کر اس سوسائٹی کے اندر محبوس رکھے۔ اس سے فی الواقعہ وہ سوسائٹی بڑی محکم اور وہ اسٹیٹ بڑی پائدار رہے گی۔ جس اسٹیٹ یا سوسائٹی میں منافقین کی جسقدر کثرت ہوگی وہ سوسائٹی یا اسٹیٹ اسی قدر محکم بنیادوں پر استوار ہوگی۔ یہ سیاست و عمرانیت کا ایک ایسا واضح اور مسلّم الثبوت اصول ہے جس سے ہر تجربی ذہن کماحقہ واقف ہے۔ لہٰذا مودودی صاحب کے اس جواب کی معقولیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ وہ خود فرماتے ہیں کہ

بلاشبہ ہم نفاق کی مذمت کرتے ہیں اور اپنی جماعت میں ہر شخص کو صادق الایمان دیکھنا چاہتے۔ مگر جس شخص نے اپنی حماقت سے خود اس دروازے میں قدم رکھا جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ جانے کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہ اگر نفاق کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کیلئے ہم اپنے نظام کی برہمی کا دروازہ نہیں کھول سکتے۔ (ص۵۳)

بالکل نہ کھولئے! بعض لوگوں کے نزدیک جس پنیر (CHEESE) میں جتنے زیادہ کیڑے ہوں اور وہ کلبلاتے دکھائی دیتے ہوں وہ اتنا ہی زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ وہ تو انتہائی بدذوقی تھی جس نے کہدیا

کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

قسم ہے تنگ و تاریک حجروں کی کہ سڑاند جسقدر کثیف ہوتی جائے، مُلا کے دماغ کو اتنی ہی زیادہ راس آتی ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب

اب لیجئے چوتھا اعتراض۔ یعنی یہ کہ ایک طرف اسلام "لا اکراہ فی الدین" کا اعلان کرتا ہے اور دوسری طرف وہ مذہب کی تبدیلی پر سزائے موت کا حکم سنا دیتا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہے:

رہا تناقض کا اعتراض تو اوپر کی بحث کو بغور پڑھنے کے بعد وہ بڑی حد تک خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کیلئے مجبور نہیں کرتے اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کردیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کیلئے کھلا ہوا نہیں ہے...... ہاں یہ اعتراض بظاہر کچھ وزن رکھتا ہے کہ اسلام جب اپنے پیروؤں کو تبدیلِ مذہب پر سزا دیتا ہے اور اسے قابلِ مذمت نہیں سمجھتا تو دوسرے مذاہب کے پیرو اگر اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے پر سزا دیتے ہیں تو وہ ان کی مذمت کیوں کرتا ہے؟ لیکن ان دو رویوں میں بظاہر جو تناقض نظر آتا ہے فی الواقعہ وہ نہیں ہے۔

بلکہ اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی رویہ اختیار کیا جاتا تو البتہ تناقض ہوتا۔ اسلام اپنے آپ کو حق کہتا ہے اور خلوص کے ساتھ حق ہی سمجھتا ہے اس لئے وہ حق کی طرف آنیوالے اور حق سے منہ موڑ کر واپس جانے والے کو مساوی نہیں رکھ سکتا۔ (صفحہ ۴۹)

اس کے جواب میں اگر آپ یہ کہیں کہ دنیا کا ہر مذہب اپنے آپ کو حق پر کہتا ہے تو پھر ان مذاہب کو یہ حق کیوں نہیں پہنچتا کہ وہ بھی ایسی ہی روش اختیار کرلیں۔ اس کے جواب میں شاید مودودی صاحب یہ فرماوینگے کہ وہ اپنے آپ کو حق پر تو کہتے ہیں لیکن وہ "بالکل خلوص کے ساتھ" اپنے آپ کو حق پر نہیں سمجھتے۔ اس لئے اگر وہ یہی روش اختیار کرلیں تو انہیں اس کا قطعاً حق نہیں پہنچتا۔ نحن ابناء اللہ۔ ہم تو خدا کے چہیتے بیٹے ہیں۔ سوتیلے بیٹوں کو ہماری برابری کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے! ہم جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر گھروں میں ڈال سکتے ہیں لیکن کسی دوسری قوم کو حق حاصل نہیں کہ وہ ہماری عورتوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرے۔ اس لئے کہ ہم تو حق پر ہیں اس لئے جو جی میں آئے کرسکتے ہیں اور لوگ حق پر تھوڑے ہیں۔ اسی طرح ہم اس شخص کو جو ہمارا مذہب چھوڑنا چاہے نہ تیغ کرسکتے ہیں لیکن دوسرے مذاہب کے لوگ قطعاً ویسا نہیں کرسکتے لیجئے: چوتھے اعتراض کا جواب بھی مل گیا۔

تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہوگئے!

اگر اس پر بھی آپ مطمئن نہ ہوسکیں تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ایک عدد فارم ممبری پُر کرکے 'اسلامی جماعت کے حلقے میں شامل ہوجائیے۔ شخصیت پرستی آپ کی عقل و بصیرت کو مفلوج کردیگی۔ اس کے بعد حضرت صاحب کا ہر ارشاد وحیِ خداوندی دکھائی دیا کرے گا۔ پھر اطمینان ہی اطمینان ہے۔

پیدائشی مسلمان کا کیا ہوگا؟

مودودی صاحب اپنے جوابات میں بار بار کہتے چلے آئے ہیں کہ جو شخص اسلام لانا چاہے ہم اسے پہلے ہی متنبہ کردیتے ہیں کہ اگر اس کے اندر داخل ہوئے تو پھر اس سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر اس میں داخل ہونا ہے تو سوچ سمجھ کر داخل ہونا۔ ہمارے اس اعلان کے بعد جو شخص "خود اپنی حماقت سے" اس مکڑی کے جالے میں پھنس جائے، اسے اس سے نکل جانے دینا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔

اس سے فطری طور پر ایک خیال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ ایک ہندو کو تو آپ نے متنبہ کردیا کہ

تم نے ہونا ہو تو کھا پی کے مسلماں ہونا

لیکن ایک بچہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ وہیں جوان ہوتا ہے۔ وہ پیدائشی مسلمان ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ بڑا ہوکر مذہب تبدیل کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت دی جائے گی یا اسے بھی حوالۂ دار و رسن کردیا جائیگا یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اس کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیروؤں کے درمیان احکام میں فرق نہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کبھی کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے۔

یہ تو ہوا اصولی جواب۔ عملی جواب یہ ہے:

کہ جو اندیشہ ہمارے معترضین بیان کرتے ہیں وہ درحقیقت عملی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئی نسلوں کی بہت بڑی اکثریت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نظام کے اتباع پر راضی اور اس کی وفادار بن کر اٹھتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں صرف چند افراد ہی ایسے پیدا ہو سکتے ہیں جو مختلف وجوہ سے انحراف و بغاوت کا میلان لئے ہوئے اٹھیں یا بعد میں اس کا اکتساب کرلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے افراد کے لئے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو ریاست کے حدود سے باہر جا کر اس سے انحراف کریں ۔ ۔ ۔ یا وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالیں اور جان جوکھوں کا وہ کھیل کھیلیں جس کے بغیر کسی نظام کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائیگی اور قانون اسلام کی طرف سے ان کے لئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھر گیا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفقہ علیہ فیصلہ ہے۔ (ص ۲۹)

سن لیا آپ نے جواب؟ کیوں ہے کوئی چھٹکارے کی شکل؟ اسلام نہ ہوا مذاق ہوا! لا اکراہ فی الدین کو شہد لگا کر چاٹا کرو۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ مُلا کے نزدیک اس کی کیا قیمت ہے؟ فیصلہ وہی ہے جو تمام "فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے"۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ (یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیتے ہیں) تو یہ صرف یہود اور نصاریٰ کے لئے تھا مسلمانوں کو کھلی چھٹی ہے کہ خدا کے کھلے کھلے فیصلوں کو چھوڑ کر فقہا کے فیصلوں کو دین بناتے چلے جائیں۔ انھیں کون پوچھنے والا ہے!

لیکن ہمیں حیرت ہے کہ مودودی صاحب یہیں کیوں رک گئے۔ ایک قدم آگے کیوں نہ بڑھے۔ ایک حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ ہر بچہ دین فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین اسے یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ ہندوؤں کے ہاں بھی پیدا ہو تو بھی وہ مسلمان ہی ہوگا۔ یعنی دنیا کا ہر بچہ پیدائشی مسلمان ہوتا ہے لیکن غیر مسلم ماں باپ اسے بعد میں مرتد بنا دیتے ہیں۔ اور چونکہ پیدائشی مسلمان کے مرتد ہو جانے کی سزا بھی قتل ہے، اس لئے دنیا کا ہر بچہ جو غیر مسلموں کے گھر میں پیدا ہوا واجب القتل ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ اس نے اپنے پیدائشی مذہب (اسلام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا ہے۔

سبحان اللہ! کیا حسین ہے یہ اسلام جو مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں!

بوجد آرد زمین و آسمان را

قوت کا استعمال

یہ تو تھے اعتراضات کے جوابات۔ اس کے بعد مودودی صاحب اس مسئلہ کے ایجابی پہلو کی طرف آتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ تبدیلئ مذہب کو زبردستی روکنے کے لئے قوت کا استعمال کیوں ضروری ہے۔ بحث کا یہ حصہ سب سے اہم ہے۔ اسلئے کہ وہ اصلی مقصد جس کے لئے یہ سارا جال بچھایا گیا ہے یہیں پہنچ کر نمایاں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطۂ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو، آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں جو اس نظام کے درہم برہم کرنے والے ہوں؟ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ بتائے کہ دنیا میں کب ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا؟ آج کونسی ریاست ایسی ہے جو اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہے؟ اشتراکی اور فاشسٹ ریاستوں کو چھوڑیئے۔ ان جمہوری ریاستوں ہی کو لیجئے جن کی تاریخ اور جن کے نظریات سے موجودہ زمانے کی دنیا نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ . . . کیا یہ اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ (ص۵۵)

انگلستان اور امریکہ کا قانون

اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے قانون میں "تبدیلیٔ قومیت" کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے یہ امر بھی قتلِ مرتد کے جواز (بلکہ وجوب) کی دلیل ہے۔

ہم اس حصے کے متعلق کسی تفصیلی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اس لئے کہ بفرضِ محال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ انگلستان اور امریکہ کے قانون کی رو سے "تبدیلیٔ قومیت" کی سزا موت ہے تو ہمارے طریقِ فکر کی رو سے، یہ چیز ایک مسلمان کیلئے دینی حجت نہیں بن سکتی۔ اگر کوئی چیز خدا کے دیئے ہوئے قانون میں موجود ہے اور وہی چیز کسی قوم نے اپنی بصیرت سے اپنے ہاں رائج کر رکھی ہے تو ہم اس چیز کو قرآن کی حقانیت کیلئے تائیداً پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی چیز خدا کے قانون کے خلاف ہے تو اسے خواہ ساری دنیا کی اقوام بطور قانون اختیار کرلیں، ایک مسلمان کے نزدیک وہ باطل ہی رہے گی، حق نہیں قرار پا جائے گی۔ اس لئے کسی ایسی بات کو بطور حجتِ دینی یا بطور دلیل و برہان پیش کرنا، مودودی صاحب ہی کو زیب دے سکتا ہے ہم اس کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ مسلک انہی کا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ان غیر مسلم اقوام کے نظام کو طاغوتی نظام بھی قرار دیا جائے اور دوسری طرف ان اقوام کے قوانین کو، قرآن کے علی الرغم، بطور دلیل و حجت پیش کیا جائے۔

اس اصولی فرق کے بعد ہم اس باب میں ایک دو امور کے متعلق محض جزئی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> کوئی شخص، خواہ پیدائشی رعایائے برطانیہ ہو یا باختیار خود برطانوی رعایا میں داخل ہوا ہو، از روئے قانون یہ حق نہیں رکھتا کہ مملکت برطانوی کے حدود میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کرلے اور کسی دوسری وفاداری کا حلف اٹھائے یا جس قومیت سے وہ پہلے تعلق رکھتا تھا اس کی طرف پھر واپس چلا جائے۔ یہ حق اسے صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ برطانیہ کی حدود سے باہر ہو۔

مودودی صاحب نے اس قانون کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور نہ ہمیں اس قسم کا کوئی قانون کہیں نظر آیا ہے۔ حدود مملکتِ برطانیہ میں اس قسم کی پابندی کے متعلق ہم نے تو کبھی سنا نہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جو شخص "حالتِ جنگ میں برطانوی قومیت اور کسی ایسے اسٹیٹ کی وفاداری اختیار کرلے جو بادشاہ برطانیہ سے برسرِ جنگ ہو" یا وہ "بادشاہ کے دشمنوں سے تعلق رکھے" یا "بادشاہ یا ملکہ یا ولی عہد کی موت کے درپے ہو" اس کی سزا موت ہے۔ لیکن اس کے متعلق انھوں نے خود ہی لکھ دیا ہے کہ یہ اس لئے کہ اس چیز کو "غدرِ کبیر"

(HIGH TREASON) " قرار دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بغاوت کے جرم کی سزا سے 'ارتداد کے جرم کی سزا کے لئے دلیل لانا' سوال از آسمان، دلیل از ریسماں کے مرادف ہے۔ (بغاوت کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے۔ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا)۔

برطانیہ اور امریکہ سے آگے بڑھ کر مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

> یہ کچھ انہی دونوں سلطنتوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئے گا کہ ایک اسٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دباتا ہے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ (ص ۶۵)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ کونسی حکومتیں ہیں جو اس اصولِ سیاست و آئینِ ریاست کا ذہنی پس منظر بن رہی ہیں! اقتباس بالا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان کے دل میں (TOTALITARIAN STATE) کا تصور کروٹیں لے رہا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں نازی ازم، فاش ازم

اسٹیٹ کا بُت

بلکہ روس کی اشتراکی آمریت مچل رہی ہے اور زبان سے جمہوری حکومتوں کا نام لیا جا رہا ہے۔ دورِ حاضر کی ابلیسی سیاست کا پیدا کردہ سب سے بڑا معبود 'ریاست' (STATE) کا تصور ہے۔ جو کچھ کبھی خدا کے لئے کہا یا کرایا جاتا تھا اب وہ سب کچھ ریاست (STATE) کے نام پر کرایا جاتا ہے۔ اسٹیٹ ایک ایسی قربان گاہ ہے جس پر فرد کے خون کا ہر قطرہ بطور چڑھاوا چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس نئے مذہب میں وجود درحقیقت اسٹیٹ کا ہے' فرد کا نہیں۔ لیکن (STATE) ایک ایسی مجرد (ABSTRACT) شے کا نام ہے جس کی کوئی مشہود تعریف (DEFINITION) ہی نہیں ہوسکتی۔ البتہ جب آپ اسٹیٹ کا تجزیہ کریں تو وہ چھل چھلا کر نام رہ جاتا ہے' اس گروہ کا جس کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اسٹیٹ کا بت (IDOL) جس کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے وجود اور اپنے نظام کی حفاظت کے لئے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حق ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق (INHERLENT RIGHT) ہے۔ (ص ۶۶)

غور کیا آپ نے! "ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے" یہ الفاظ ہٹلر، موسولینی اور لینن کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جن کے نزدیک ریاست ایک جیتے جاگتے فرد کی طرح اپنا وجود رکھتی ہے جس کی ایک فطرت ہوتی ہے اور (ہندوؤں کی کالی ماتا کی طرح)

قوت کا استعمال

اس فطرت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے قوت کا استعمال کرے۔

آپ نے دیکھا کہ "قتل مرتد" کے وجوب کے لئے مودودی صاحب کہاں کہاں سے اسناد اور دلائل اور کس کس مقام سے جواز کے فتوے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لا رہے ہیں۔ مقصد تو اپنی بات کے لئے دلیل لانا ہے' اس سے کیا غرض کہ وہ دلیل آتی کہاں سے ہے۔

> مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

دلیل کا وزن بھی ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ "یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے" یعنی کسی قاعدے کے برسرِ حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ "عالمگیر مقبولیت" رکھتا ہو۔ یہ وہی "عالمگیر مقبولیت" ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ۔ ان یتبعون الا الظن۔ وان ھم الا یخرصون (۶/۱۱۶)

اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں خود مودودی صاحب لکھتے ہیں:

یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں علم کے بجائے قیاس وگمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیلات، فلسفے، اصولِ زندگی اور قوانینِ عمل، سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے، نہ کہ وہ جس کو لوگوں نے بطور خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ نے بتائی ہے۔ چاہے اس راستے پر چلنے کے لئے وہ دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔" (تفہیم القرآن۔ ۷۶-۵۷۵)

لیکن یہ باتیں تو صرف تفسیروں میں لکھنے کی ہیں۔ عمل تو اس اصول پر ہونا چاہیئے کہ اگر اپنے مطلب کے مطابق بات، کتاب اللہ سے ملتی ہے تو اسے بطور دلیل پیش کر دیا جائے اور اگر اس کی بجائے (بلکہ اس کے خلاف) دنیا کا کوئی "عالمگیر مقبولیت" والا قاعدہ سامنے آتا ہے جس سے اپنا مقصد پورا ہوتا ہو تو اسے بطور شہادت پیش کر دیا جائے!

بہرحال مودودی صاحب نے یہ اصول بیان فرما دیا کہ اسٹیٹ کو حق حاصل ہے (اور یہ حق اس کا ذاتی ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا) کہ وہ اپنے وجود اور نظام کی حفاظت کے لئے جبر اور قوت استعمال کرے۔ اور چونکہ تبدیلیٔ مذہب سے اسٹیٹ کے وجود کی حفاظت مخدوش ہو جاتی ہے اس لئے اسٹیٹ کو حق حاصل ہے کہ اس تبدیلی کو موت کی سزا کے خوف اور تلوار کی قوت سے روکے۔

اس "مسلمہ" کے بعد (جس کے ثبوت میں کوئی قرآنی دلیل نہیں پیش کی گئی۔ کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی) مودودی صاحب نکھر کر سامنے آتے ہیں اور صاف صاف الفاظ میں بتاتے ہیں کہ اس قوت کے استعمال کا حق کیسے حاصل ہے۔ مسلمہ یہ تھا کہ اسٹیٹ کو حق حاصل ہے کہ وہ "جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دبائے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو" اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ (مثلاً) حکومتِ پاکستان نے مودودی صاحب کو اگر جیل خانے بھجوا دیا تھا تو وہ بھی اسی مسلمہ کے تحت تھا جسے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے اور جس کے مطابق اسٹیٹ کا یہ ذاتی حق ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے انتشار پیدا کرنے والے عناصر کو بزور روکے۔

لیکن

لیکن قوت کے استعمال کا حق صرف....

یہاں پہنچکر مودودی صاحب واضح الفاظ میں کہدیتے ہیں کہ نہیں! یہ حق ہر اسٹیٹ کے کارندوں کو نہیں پہنچتا۔ یہ حق صرف انھیں پہنچتا ہے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے ذمے دار ہوں۔ یہ حق حکومتِ پاکستان کو نہیں پہنچتا۔ یہ حق صرف اسلامی حکومت اور ان کے امیر کو پہنچتا ہے، کیونکہ ان کے ہاتھوں سے جو حکومت قائم ہوگی وہ حق کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

> ہمارے نزدیک خدا کی حاکمیت کے سوا ہر دوسری حاکمیت یا ریاست کی تعمیر سرے سے ناجائز ہے۔ اس لئے جو ریاست بجائے خود ناجائز بنیاد پر قائم ہو اس کیلئے ہم اس بات کو جائز تسلیم نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے ناجائز وجود اور غلط نظام کی حفاظت کے لئے قوت استعمال کرے۔ . . . . (اپنے وجود کی حفاظت کیلئے جبر اور قوت کا استعمال کرنا ریاست کا ذاتی حق ہے۔ لیکن) اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بنا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو۔ اسلئے کہ باطل کا وجود بجائے خود ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام و بقا کے لئے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔ (ص۶۶)

دیکھا آپ نے کہ "قتلِ مرتد" کی تان کہاں آکر ٹوٹی ہے؟ یعنی

(i) ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ لوگوں کو بہ جبر اپنے حلقۂ اقتدار میں رکھے۔

(ii) لیکن یہ حق صرف اس ریاست کو حاصل ہے جو حق پر قائم ہوئی ہو۔

(iii) حق پر وہی ریاست قائم ہوتی ہے جس میں شریعت کا نظام رائج ہو۔

(iv) نظامِ شریعت ملا کے ہاتھوں رائج ہو سکتا ہے۔

(v) آج یہ نظام اسلامی جماعت کے ہاتھوں قائم ہوگا۔ اس لئے

(vi) جب زمامِ اقتدار اسلامی جماعت کے ہاتھ میں آئیگا تو انھیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ہر اُس عنصر کے خلاف جو ان کی دانست میں اس نظام کے انتشار کا باعث ہو قوت اور جبر کا استعمال کریں۔

دیکھا آپ نے کہ بات کہاں سے چلی اور کہاں جا پہنچی! اور اس بحر کی تہ سے اچھل کر کیا نکلا؟ اسی لئے تو کہتے تھے کہ

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ　　کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے!

قتلِ مرتد کی روایات کیوں وضع ہوئیں؟

اب آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کی ایسی واضح تعلیم اور ایسے کھلے کھلے احکام (بابت آزادیٔ مذہب) کے علی الرغم، قتلِ مرتد سے متعلق روایات کیوں وضع کی گئیں! صاف ظاہر ہے کہ جب تک یہ مقدس بنیاد نہ تیار کی جاتی اس پر استبداد اربابِ شریعت کی یہ قہرمانی عمارت کبھی تعمیر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سب کچھ

اس لئے کیا گیا کہ قوت کو اپنے ہاتھ میں رکھا جائے۔ لیکن اس "مقدس استبداد" کی تفصیل سننے سے پہلے مختصراً یہ دیکھنے جائیے کہ قوت کسے کہتے ہیں۔ حکومت کا تصور کس طرح وجود میں آیا اور قرآن نے اس کا کیا علاج کیا۔ اس کے بعد یہ سمجھ میں آجائے گا کہ "قتل مرتد" سے حقیقی مفہوم کیا تھا!۔

انسانی تاریخ کے صفحات کو دیکھئے۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل داستان نظر آئیگی حاکم و محکوم اور صید و صیاد کی۔ جن لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرلیا انھوں نے دوسروں کو اپنی محکومیت کے پنجے میں جکڑ لیا اور اس کے بعد ....

ملوکیت اور پیشوائیت

ہر حربہ استعمال کیا اس مقصد کے لئے کہ جو ایک دفعہ محکوم ہوچکا ہے وہ حلقۂ محکومیت سے نکلنے نہ پائے۔ اس مقصد کے لئے ملوکیت نے انسانی جسم کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنوائیں اور پیشوائیت (PRIESTHOOD) نے انسانی ذہن کی جکڑ بندیوں کے لئے عقیدت وارادت کے دام ہمرنگ زمین تیار کئے۔ ان دونوں کے باہمی سمجھوتے نے راجہ کو ایشور کا اوتار، بادشاہ کو ظل اللہ اور کنگ کو حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) کا حامل بنا دیا۔ تاج کی وفاداری اور تخت کی اطاعت شعاری "فرائض خداوندی قرار پاگئے" مغرب میں جب بادشاہت کی شخصی حکومت کے خلاف احتجاج ہوا تو وہاں کے سیاستدانوں نے پرانی اصطلاحوں کی جگہ چند جدید اصطلاحات وضع کیں اور اس طرح عوام کو فریب دیدیا کہ حاکمیت کا استبداد کہن، سلطانی جمہور میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اس نظریے کی تبدیلی کے بعد انھوں نے پرانے بتوں (IDOLS) کی جگہ نئے نئے بت تراشنے شروع کئے۔ اب تخت و تاج کی جگہ وطن (MY COUNTRY) نے لے لی۔ یہ جمہوریت کی اصطلاح تھی۔ اس کے برعکس (TOTALITARIAN STATE) کی فاشزم نے وطن کی جگہ ریاست (STATE) کی اصطلاح وضع کی۔ "ریاست یا مملکت افراد سے بلند ہے"۔ "افراد کی ہستی ریاست کے لئے ہے"۔ ریاست ذاتی حقوق (INHERENT RIGHTS) کی مالک ہے جو اس سے کسی صورت میں بھی چھینے نہیں جاسکتے۔ جو ان حقوق میں دخل اندازی کا ارادہ کرے' وہ غدار ہے۔ باغی ہے۔ ریاست کو حق حاصل ہے کہ اسے فنا کے گھاٹ اتار دے۔ ریاست کی حفاظت کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ ریاست (STATE) ایک مجرد اصطلاح (ABSTRACT TERM) ہے جس کی آجتک کوئی جامع تعریف نہیں ہوسکی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اسٹیٹ بالآخر کہتے کسے ہیں۔ ان سیاسی مہرہ بازوں نے عوام کو اس مجرد اصطلاح کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا اور اس کے پردے میں وہ سب کچھ کرتے چلے گئے جو ملوکیت کیا کرتی تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ملوکیت کے دور میں لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ان پر جور و استبداد کس کی طرف سے ہو رہا ہے، لیکن اب یہ صورت ہوگئی کہ قتل ہو رہے ہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ قاتل کون ہے اور خون بہا کس کے ذمے ہے۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کے لئے ہوتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسٹیٹ کہتے کسے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ جس طرح ذہن انسانی کے عہد طفولیت میں، پیشوائیت نے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا تھا اور ان کے نام پر سب کچھ روا رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح عہدِ جدید میں اسٹیٹ کے وجود کا بُت تراشا گیا ہے۔ صرف الفاظ بدلے ہیں، روح وہی ہے۔

قرآنی انقلاب

قرآن نے آکر کہا کہ حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ انسانوں کو مل جل کر رہنا ہے۔ اس کیلئے انھیں ایک معاشرتی نظام کی ضرورت ہے۔ یہ معاشرتی نظام دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جسے انسان اپنے قیاسات کی رو سے قائم کریں۔ دوسرے وہ جسے وحی کے عطا فرمودہ اصولوں کی روشنی میں قائم کیا جائے۔ وحی کی رو سے قائم کردہ معاشرہ کا نام اسلامی زندگی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ اسلامی معاشرے کے قیام کی صورت یہ ہے کہ جو لوگ بغیر کسی جبر و اکراہ کے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ فی الواقعہ وحی کی رو سے قائم ہونے والا معاشرہ، انسانی زندگی کے لئے بہترین معاشرہ ہے، وہ (اس اشتراک ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر) باہمی نظم و ربط پیدا کریں۔ اس سے اس معاشرے کا وجود عمل میں آجائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاشرہ کی بنیاد ایمان پر ہے۔ پھر سن لیجئے کہ ایمان سے مراد ہے اس حقیقت کو بطیب خاطر تسلیم کرنا کہ انسانی زندگی کے لئے صحیح معاشرہ وہی ہے جو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاشرہ کی بنیاد ہی ایمان (IDEOLOGY) پر ہے اور ایمان صرف اس وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب وہ دل کی رضامندی سے قبول کیا جائے۔

اسلامی نظام کی بنیاد دل کی رضامندی پر ہے

اس لئے اس معاشرہ کے قیام میں جبر و اکراہ کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اس معاشرہ کے افراد اپنے دل کے فیصلے سے اس نظام کے اجزا بنتے ہیں۔ اس لئے جس طرح وہ شخص اس نظام کا جزو نہیں بن سکتا جس کا دل اس نظام کی اصلیت کی گواہی نہ دے۔ اسی طرح وہ شخص بھی اس نظام کا جزو نہیں رہ سکتا جو اس نظام میں داخل تو ہو جائے لیکن اس کے بعد اس کا دل اس کی اصلیت سے مطمئن نہ ہو۔ قرآن جس طرح اول الذکر کو اس نظام کا جزو بننے پر مجبور نہیں کرتا اسی طرح ثانی الذکر کو بھی زبردستی اس نظام کا جزو بنے رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس نظام کی بنیاد ہی دل کی رضامندی (ایمان) پر ہے۔ جہاں جبر آیا، یہ نظام ٹوٹا۔ جبر سے محکوم تو اکٹھے رکھے جا سکتے ہیں، ایک صالح نظام کے اجزا یکجا نہیں رکھے جا سکتے۔ ایک صالح نظام کے افراد کا باہمی تعلق، ائتلاف قلب سے ہوتا ہے۔ یعنی دل و نگاہ کی ہم آہنگی اور یک رنگی۔ یہ ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ کی ہم آہنگی جبر سے پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہدیا کہ دلوں کی یک رنگی (ائتلاف قلوب) جو اس نظام کے افراد کی خصوصیت ہے، صرف ایمان سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم (۸/۶۳) "اگر تو جو کچھ زمین میں ہے، سب کچھ خرچ کر دیتا، تو بھی ان کے دلوں میں ائتلاف پیدا نہ کر سکتا۔" جو افراد قلبی ہم آہنگی کے بجائے دیگر مقاصد کی خاطر ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں ان کے متعلق قرآن نے بتایا کہ تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتیٰ (۵۹/۱۴) "تو انھیں اکٹھا سمجھتا ہے حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔" اور جن لوگوں کو زبردستی باندھ کر رکھا جائے ان کا اس طرح اکٹھا رہنا، منافقت کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ بطیب خاطر نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ اس نظام کے اجزا کس طرح بن سکتے ہیں جس نظام کی بنیاد ہی قلبی ہم آہنگی پر ہو۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کا اس نظام کی اصلیت پر ایمان نہ رہے، انھیں نظام سے نکل جانے دیجئے۔ ان کی جگہ خدا ایسا گروہ لے آئے گا جس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہوں گی جن سے اس نظام کا قوام تیار ہوتا ہے۔ سنئے کہ

وہ خصوصیات کیا ہیں۔ فرمایا:

یا یھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ۔ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین۔ یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ واللہ واسع علیم (۵/۵۴)

اے ایمان والو۔ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے گا۔ تو قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کر دے گا جنھیں خدا دوست رکھے گا اور وہ خدا کو دوست رکھیں گے۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم۔ لیکن کفار کے مقابلے میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جان لڑا دینے والے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے۔ وہ اپنے فضل میں بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے۔

ذرا سوچئے کہ اگر ان لوگوں کو جو دل سے اس نظام کے اجزا بن کر نہ رہنا چاہیں موت کے خوف سے اس نظام کے جزو بنے رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیا وہ ان خصوصیات کے حامل ہو سکیں گے کہ

(i) وہ خدا کو دوست رکھیں۔

(ii) اپنی جماعت کے دیگر مخلص ارکان کے ساتھ ان کا سلوک نہایت نرم روی اور محبت قلبی کا ہو۔

(iii) جماعت کے مخالفین کے مقابلے میں نہایت سخت ہوں۔

(iv) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ اور

(v) خدا کی راہ میں جانیں لڑا دیں۔

اس لئے ایسے لوگ کبھی اسلامی نظام کے اجزا بنا کر نہیں رکھے جا سکتے۔ اسلامی نظام کے اجزاء صرف انہی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو ان خصوصیات کے حامل ہوں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اسلام یقیناً اپنے نظام کا تحفظ چاہتا ہے، لیکن اس کے تحفظ کی

قلبی اطاعت

قوت کا راز افراد ملت کے ایمان محکم میں ہوتا ہے جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کو زبردستی ملت کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے ان کا وجود نظام کے استحکام کی بجائے، اس کی سخت کمزوری کا باعث ہوتا ہے اس کا کسی زمانے میں خود مودودی صاحب کو بھی اقرار تھا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی)۔

اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لا الہ الا اللہ کہدے مگر اس کا دل بدستور ما سوا اللہ کا شکدہ بنا رہے تو یہ تصدیق بالقلب کے بغیر اقرار باللسان اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں اور اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ یہ تو خیر بڑی چیز ہے۔ دنیا کی معمولی تحریکیں بھی جن کا منشا محض دنیوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے اپنی کامیابی کیلئے ایسے پیروؤں پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتیں، جو صرف زبان سے ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوں مگر دل سے ان کے مؤید نہ ہوں۔ بیدل،

غیر مخلص اور جھوٹے پیروں کو لیکر آجتک کسی تحریک نے کامیابی کا منہ نہیں دیکھا ہے اور یقیناً ایسے گوشت پوست کے لوتھڑوں کو لیکر جو صداقت کی روح سے بالکل خالی ہوں کوئی شخص دنیا کے میدانِ مسابقت میں قدم رکھنے کی جرأت اور فوز و فلاح تک پہنچنے کی امید نہیں کر سکتا۔ پھر بھلا غور کرو کہ جس دین کے پیش نظر دنیا کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی فوز و فلاح ہو۔ جو دین نیت اور اعتقاد کو عمل کی بنیاد قرار دیتا ہو، جو دین خلوص و صداقت کی روح کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہ سمجھتا ہو۔ . . . کیا ہو سکتا تھا کہ وہ خلوص و صداقت کو چھوڑ کر مجبورانہ اطاعت اور بے چارگی کے اقرار پر قناعت کرتا۔ . . . اگر وہ ایسا کرتا تو کیا اسے وہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی جو اس نے فی الحقیقت حاصل کی ہے۔ (ص ۱۲۶-۱۲۵)

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ خلوص و صداقت اور تصدیق قلب سے تمہاری آئیڈیالوجی کے موید نہ رہیں ان کی مجبورانہ اطاعت اور بے چارگی کے اقرار کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس لئے انھیں اس قسم کی اطاعت پر مجبور کرکے اپنے نظام کا جزو بنائے رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سے کہدو کہ تمہارے جانے سے اس نظام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس نظام کی تقویت کا راز ان لوگوں کے ایمان میں ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبھم و یحبونہ . . . یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ (۵/۵۴)

دنیا کی سٹیٹ اپنی حفاظت کیلئے بیشک ایسے جوش و عاکر اپنے ساتھ رکھتی ہیں جنھیں بنوکِ شمشیر باندھ کر ساتھ رکھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن انھیں فرعونی اسٹیٹ اور طاغوتی نظام قرار دیتا ہے۔ اسلامی نظام اور قرآنی اسٹیٹ میں جبر و تغلب اور جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسٹیٹ ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو اس راہ میں سر جھکانے سے پہلے دل جھکا چکے ہوتے ہیں۔ لہذا جس کا دل اس اسٹیٹ کے بنیادی تصورات سے سرکشی اختیار کر چکا ہو وہ اس اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی میں شامل نہیں رہ سکتا۔ اس اسٹیٹ میں اس کا مقام وہی ہے جہاں اس قسم کے افراد رہتے ہیں جن کا دل اس اسٹیٹ کی آئیڈیالوجی کا قائل نہیں لیکن وہ اس کے سایہ امن و عاطفت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انھیں ذمی یا مستامن کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہ لوگ (خواہ منافقانہ طور پر نظامِ ملت کے اجزاء رہتے ہوئے یعنی مسلمان کہلاتے ہوئے۔ اور خواہ کفر کی آغوش میں آکر ذمی بنکر رہتے ہوئے) اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کریں تو ان کا دفعیہ بزور شمشیر کیا جائے گا۔ قرآن نے اس باب میں واضح حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

بغاوت کی سزا

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض۔ ذالک لھم خزیٌ فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم (۵/۳۳)

بلاشبہ جو لوگ خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کے خلاف جنگ کریں اور ملک میں فساد برپا کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ یا سولی پر چڑھا دیا جائے۔ یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں (یا انھیں الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال دی جائیں) یہ ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہو اور آخرت میں بھی ان کیلئے عذاب عظیم ہے۔

یعنی قرآن کی رو سے بغاوت کی سزا موت ہے یا دوسری سزاؤں میں سے کوئی سزا جسے اقتضائے حالات کے مطابق مناسب سمجھا جائے۔ بغاوت کی صورت میں بھی قرآن نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ اگر باغی، گرفتاری سے قبل اپنے فعل سے پشیمان ہو کر تائب ہو جائیں تو انھیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آیۂ ماسبق سے متصل یہ آیت ہے۔

الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم (۵/۳۴)

لیکن اگر وہ، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پالو، توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مرتد اور باغی میں فرق

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے مرتد اور باغی کو الگ الگ صفوں میں رکھا ہے۔ مرتد وہ ہے جسے اسلامی آئیڈیالوجی سے اختلاف ہو جائے لیکن وہ اس کے بعد مملکت کا امن پسند شہری بنکر رہنا چاہے۔ قرآن کی رُو سے اس کی کوئی سزا نہیں کیونکہ اسلامی آئیڈیالوجی سے اختلاف رکھنا کوئی جرم نہیں۔ اس کے برعکس باغی وہ ہے جو اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جرم ہے اور اس کی سزا قرآن نے مقرر کر دی ہے۔ مودودی صاحب نے قتلِ مرتد کے وجوب میں جس قدر دلائل پیش کئے ہیں وہ درحقیقت مملکت کے خلاف بغاوت سے متعلق ہیں۔ (آپ ایک بار پھر ان کے پیش کردہ دلائل کو سامنے لائیے، بات واضح ہو جائے گی)۔ اس طرح انھوں نے دونوں (بغاوت اور ارتداد) میں التباس پیدا کر کے قتلِ مرتد کو (بزعمِ خویش) عقلاً بھی ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ جو کچھ انھوں نے ثابت کیا ہے وہ فقط یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مملکت بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اسی طرح اسلامی مملکت بھی باغیوں کو کھلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ قرآن میں اس کے متعلق واضح حکم موجود ہے۔ لیکن اس آیت کو انھوں نے کہیں درج نہیں کیا، اس لئے کہ اگر اسے درج کر دیتے تو پڑھنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن باغی اور مرتد میں فرق کرتا ہے اور مودودی صاحب باغیوں سے متعلق دلائل و احکام کو مرتدین سے چپکا کر اپنے دعوے کا اثبات چاہتے ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد یا افراد کا گروہ، اسلام سے ارتداد کے ساتھ ہی مملکت کے خلاف بغاوت بھی شروع کر دے۔ اس صورت میں ان کی سرکوبی، جرمِ بغاوت کی بنا پر کی جائے گی نہ کہ ارتداد کی وجہ سے۔ اگر تاریخ میں، خلافتِ راشدہ کا کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جس میں "مرتدین" کے خلاف جنگ کی گئی ہو تو اس کی یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ ان مرتدین نے بغاوت بھی کی ہوگی۔ جس کی بنا پر ان کے خلاف اس قسم کی کاروائی کی گئی۔ اس لئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ صحابہ کبارؓ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے قرآن کی ایسی واضح تعلیم کی اس قدر کھلی ہوئی مخالفت کی ہوگی۔ مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات اس کی جرأت کریں تو کریں، ہم تو ایسا نہیں کر سکتے۔

پھر کیا ہوا؟

یہ ہے نقشہ اس نظام کا جس کی تشکیل قرآن چاہتا ہے۔ یعنی ان افراد پر مشتمل نظام جو اس نظام کے اساسی اور بنیادی اصولوں کو نصب العینِ حیات قرار دے چکے ہوں اور بطیبِ خاطر اس نظام کے قیام کو

اپنی زندگی کا مقصد بنا چکے ہوں۔ اس نظام میں جبر اور استبداد کا سوال تک ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طاغوتی نظام اور قرآنی نظام میں یہی تو فرق ہے۔ یہ نظام رسول اللہؐ اور صحابہؓ نے قائم کیا۔ لیکن جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو اسلامی نظام کا یہ نقشہ بھی یکسر بدل گیا جس میں نظام کی تشکیل بطیبِ خاطر اور برضا و رغبت ہوتی تھی۔ اب حاکم و محکوم کی تفریق پھر پیدا ہو گئی اور پھر وہی جبر و اکراہ شروع ہو گیا۔ ملوکیت کے ساتھ ہی ثنویت (DUALISM) بھی آ گئی اور دین، سیاست اور مذہب میں بٹ گیا۔ سیاست کے علمبردار ارباب حکومت تھے اور مذہب کے نمائندے ارکانِ شریعت۔ اربابِ شریعت نے دیکھا کہ بادشاہ کے خلاف سرکشی کی سزا تو قتل ہے لیکن ان کے خلاف سرکشی کی کوئی سزا ہی نہیں۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ بادشاہ کو تو اتنے اختیارات حاصل ہو جائیں اور ارباب شریعت خالی فتوے دینے کیلئے رہ جائیں۔ انھوں نے سوچا کہ مذہب کے خلاف سرکشی (ارتداد)

وضع روایات

کی سزا بھی موت ہونی چاہئے۔ قرآن سے تو اس کی سند مل نہیں سکتی تھی اس لئے انھوں نے وہی کیا جو ایسی صورت میں مذہب کے دوسرے گوشوں میں کیا گیا تھا۔ اس کے لئے آسانی سے چند روایات وضع کیں اور انھیں منسوب کر دیا حضور رسالتمآبؐ کی طرف۔ لیجئے! اربابِ مذہب کے اختیارات، اربابِ حکومت سے بھی بڑھ گئے۔ آپ شاید دل میں سوچیں کہ ان کے اختیارات، اربابِ حکومت سے کس طرح بڑھ گئے؟ یہ بھی سن لیجئے۔

اس وقت تک آپ یہی سمجھتے چلے آئے ہوں گے کہ مرتد کے معنی ہیں وہ شخص جو اس امر کا اعلان کر دے کہ میں اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی مسلمان کے بجائے کافر ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے بھی اپنے مقالہ میں اس امر کی بڑی احتیاط

مرتد کون ہے؟

برتی ہے کہ قارئین کا ذہن اس مفہوم کے علاوہ کسی اور مفہوم کی طرف منتقل ہی ہونے نہ پائے۔ لیکن اربابِ شریعت کے نزدیک مرتد کی صرف یہی تعریف (DEFINITION) نہیں۔ آپ آئے دن پڑھتے ہوں گے کہ فلاں صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اس خبر سے نہ تو آپ پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے نہ اس شخص پر جس پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ بلکہ کفر کے فتووں نے اب مذاق کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن "اسلامی حکومت" (یعنی مسلمان بادشاہوں کی حکومت) میں کفر کا فتویٰ مذاق نہیں تھا۔ جس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا، وہ مرتد سمجھ لیا جاتا تھا اور مرتد کی سزا قتل تھی۔ اس لئے کفر کے فتوے سے سزائے موت واجب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا اس کا خون مباح ہو جاتا تھا۔ آپ فقہ کی کتابوں میں دیکھئے۔ لمبی چوڑی بحثیں اس موضوع پر ملیں گی کہ ایک مسلمان کس طرح "عقائد" کے ذرا ذرا سے اختلاف پر کافر (یعنی مرتد) ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ مُلا کے اختیارات زیادہ وسیع تھے یا بادشاہ کے؟ بادشاہ کو جرم بغاوت ثابت کرنے کیلئے پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا لیکن ملا کے لئے تکفیر کا بہانہ کچھ دشوار نہ تھا۔ اس کیلئے فقط اتنا کہدینا کافی تھا کہ فلاں شخص کے عقائد صحیح نہیں۔ یا اس کا فلاں عقیدہ، جمہور کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس کے بعد اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا اور اسے سرِ بازار قتل کر دیا جاتا۔ نہ کوئی وکیل نہ کہیں اپیل۔ یہ صورتِ حالات بادشاہوں کے لئے بھی بڑی مفید تھی۔ وہ اگر کسی کو اپنی مصلحتوں کی بنا پر قتل کرنا چاہتے لیکن اس کے خلاف کوئی سنگین جرم ثابت نہ کر سکتے تو ملا سے اس کے کفر کا فتویٰ لے لیا جاتا اور اس کے بعد اسے آسانی سے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ "شریعت" کی رو سے باغی کو تو امان بھی دی جا سکتی تھی لیکن مرتد کیلئے کہیں امان کی جگہ نہ تھی۔ نیز اس کے قتل کے خلاف کوئی اور شخص بھی زبان تک

نہیں ہلا سکتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا "شریعت" کی تنقید و تنقیص تھی اور اس کی سزا تھی موت! ۔ اس کفر سازی نے کیا قیامت ڈھائی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو (خلافت کے بعد) مسلمانوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ اس کا کونسا صفحہ ہے جو خون کے دھبوں

خونِ ناحق کی ندیاں

سے داغدار نہیں؟ اس میں ایک ایک عقیدہ کے نام پر خود مسلمانوں نے دوسرے مسلمانوں کو جس بیدردی اور بے دریغی سے قتل کیا ہے، کفار کی مسلح کوششوں نے بھی ان کے ساتھ ایسا نہ کیا ہوگا۔ نہایت راستباز نکوکار، خدا ترس مسلمان ہے لیکن اسے ایک جزئی سے عقیدے میں اختلاف ہے۔ بس اس اختلاف سے کفر کا فتویٰ لگا لو اس فتوے نے اسے مرتد قرار دیدیا اور ملا کی کند چھری سے اسے ذبح کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک عقیدہ خلقِ قرآن کو لیجئے۔ معتزلہ نے جب تنزیہہ ذات اور نفیِ صفات کا عقیدہ نکالا تو اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن (کلام اللہ) مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اس وقت شاید آپ کہیں کہ بالآخر یہ سوال ہی کیا تھا جسے اس طرح اٹھایا گیا لیکن تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ اس ایک سوال نے خونِ ناحق کی کسقدر ندیاں بہادیں؟ دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کی پیروی میں جہم بن صفوان نے اس کا اعلان کیا۔ محدثین نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور اس عقیدے کے حاملین کو مرتد ٹھہرایا۔ اس جرم کی سزا میں خالد بن عبداللہ قسری والیِ عراق نے جعد کو عید اضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا، اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا۔ مامون الرشید کے عہد میں حالات نے پلٹا لیا اور وہ خود اور اس کے درباری قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہو گئے۔ اب محدثین پر کفر کے فتوے لگنے شروع ہوئے اور وہ جرم ارتداد کی سزا میں قتل ہونے لگے۔ اکثر علماء نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچائیں لیکن بہت سے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر سخت ترین اذیتیں جھیلتے اور موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ انہی میں امام احمد بن حنبل جیسی شخصیت بھی تھی۔ امام صاحب کو جس طرح قید و بند کے عذاب میں مبتلا رکھا گیا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ انھیں دربار میں بلا کر کوڑوں سے پٹوایا جاتا تھا اور جب وہ بیہوش ہو جاتے تو پھر قید خانے میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک دن، دو دن نہیں بلکہ پورے اڑھائی سال تک جاری رہا۔ معتصم (مامون الرشید کا جانشین) ان سب لوگوں کو قتل کر دیا کرتا تھا جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے لیکن امام صاحب کے قتل کی جرأت اس نے نہیں کی کیونکہ ان کے ساتھ عوام کی عقیدت بہت گہری تھی۔ معتصم کے جانشین، واثق نے بھی خون کی ان ندیوں میں اضافہ کیا، حتیٰ کہ احمد بن نصر کو اسی عقیدے کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کر کے "ثوابِ عظیم" کا مستحق بنا۔ احمد کے جسم کو سامرا میں سولی پر چڑھایا گیا اور اس کے سر کو بغداد بھیجدیا۔ کان میں ایک رقعہ لٹکا دیا جس میں لکھا تھا:

> یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المومنین نے بغرض تقرب الٰہی اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

خدا خدا کر کے متوکل نے اس وحشت و بربریت کو ختم کیا اور محدثین کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ مامون سے واثق تک تین خلفاء کے زمانے میں یہ ایک جزئی اختلاف جسقدر خونریزی اور غارت گری کا موجب بنا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس وحشت و بربریت کا شرعی جواز وہ چند روایات تھیں جو قتلِ مرتد کے وجوب میں وضع کر لی گئی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جسے مسلمانوں کی تاریخ میں اسلام کا درخشندہ عہد کہا جاتا ہے یعنی عباسیوں کا دور، اور عباسیوں میں بھی مامون الرشید کا زمانہ۔ جب اسقدر "مہذب زمانے" میں

جب کہ علم وفضل کا چرچا عام تھا اور "اسلامی تہذیب وتمدن" اپنے عہدِ شباب پر تھا، فتنۂ تکفیر و ارتداد کی پیدا کردہ سبعیت وبہیمیت کا یہ عالم تھا، تو مسلمانوں کے تاریک عہد میں جو کچھ ہوتا ہوگا اس کا اندازہ خود لگا لیجئے۔ ارتداد کے الزام کے ڈر سے لوگوں کی حالت یہ ہوجاتی تھی، انھیں اپنے جیب میں عقائدِ صحیحہ کا سارٹیفکٹ رکھنا پڑتا تھا کیونکہ ملا کے اس سارٹیفکٹ کے بغیر ہر وقت خدشہ رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت کوئی کفر کا فتوےٰ لگا دے اور سر بھٹے کی طرح اڑ جائے۔ پادریوں کے مظالم کی شہادت میں یورپ کے مذہبی احتساب (INQUISITION) کو بطورِ مثال پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن خود ہماری تاریخ میں عقائد کے اختلاف کی بنا پر جس قدر ظلم کیشیاں اور ستم رانیاں ہوئی ہیں، وہ پادریوں کے "احتساب" سے کچھ کم نہیں۔

ایک اہم سوال کا جواب

اس مقام پر ضمناً ایک اہم حقیقت کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ دین کے متعلق جو جو "نئی باتیں" قرآنی فکر کے حاملین کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں، پہلے لوگوں نے ان چیزوں کو پیش کیوں نہ کیا اور وہ کیوں اسی مسلک پر چلتے رہے جسے "جمہور کا مسلک" کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب ظلم و ستم کی ان داستانوں سے مل سکتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، قرنِ اول کے مختصر سے دور کے بعد ہماری پوری تاریخ ملوکیت کی تاریخ ہے جس میں مذہبی اقتدار ملا کے ہاتھ میں تھا۔ اس اقتدار کے دور میں کس کی مجال تھی کہ کوئی ایسی بات کہہ سکتا جسے ملا "عقائدِ صحیحہ" کے خلاف سمجھتا۔ "کل بدعۃ ضلالۃ" (ہر نئی بات گمراہی ہے) ملا کا یہ مستقل فتوےٰ تھا۔ اس کے مذہب میں بدعت کا دوسرا نام الحاد و زندیقیت تھا۔ اور الحاد و زندیقیت کی سزا — موت — ان حالات میں اربابِ شریعت کے اس سوال کا جواب کہ یہ "نئی نئی باتیں" اس سے پہلے ظہور میں کیوں نہ آئیں، اس سے زیادہ اور کیا دیا جاسکے کہ

شکریہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

ان حالات میں کورانہ تقلید ہی وہ مسلک تھا جس میں جان کی سلامتی نظر آتی تھی۔ انگریزوں کے عہدِ غلامی کی ہزار لعنتوں کے ساتھ، اتنی سی بات خوش آئند بھی ہوگئی کہ اس میں ملا کے ہاتھ سے وہ تلوار چھن گئی جو ہر اس مسلمان کے سر پہ بجلی بن کر چمکتی اور رعد بن کر کڑکتی تھی، جو اس سے کسی عقیدے میں ذرا سا بھی اختلاف رکھے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ انگریز کے "مذہبی آزادی" کے اعلان میں خود اس کی مصلحتیں پوشیدہ تھیں اور سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ اس کے بغیر وہ جہاد کو حرام قرار دینے والی نبوت کا تخم حشیش سرزمینِ پنجاب میں بو نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود — عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد — اس شر میں اتنا پہلو خیر کا ضرور تھا کہ اس سے ملا کی آتشیں تلوار اس کے ہاتھ سے چھن گئی) مودودی صاحب نے "انیسویں صدی کی جس تاریک خیالی" کا تذکرہ اس طنز و تحقیر کے ساتھ کیا ہے یہ اسی کا صدقہ ہے کہ وہ آج

(۱) مولویوں کی صف میں "ماڈرن" بننے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ اور

(۲) اس وقت تک یوں زندہ بھی پھر رہے ہیں۔

شق اول اس لئے کہ مودودی صاحب کے ماڈرن بننے کا راز انگریزی کے ان الفاظ میں ہے جنھیں وہ اپنی تحریروں میں اکثر استعمال

کرتے ہیں۔ اگر انیسویں صدی کی اس تاریک خیالی کے عمائدین (سرسید اور ان کے رفقاء) مولوی کی تکفیر و تفسیق کے علی الرغم، انگریزی تعلیم رائج نہ کرتے تو یہ "ماڈرنیٹ" خود مولوی صاحب کے نصیب کیسے ہوتی ؟ اور "زندہ پھرنے" کی شق اس لئے کہ مخالف گروہ کے مولوی صاحبان خود مودودی صاحب کو بھی تو بدعتی اور گمراہ قرار دے چکے ہیں۔ اگر "انیسویں صدی کی تاریک خیالی" ملا کے ہاتھ سے ارتداد کی تلوار نہ چھینتی، تو مودودی صاحب خود مولوی صاحبان کے ہاتھوں کبھی کے حوالۂ دار و رسن ہو چکے ہوتے۔ انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ پاکستان میں ابھی تک "قانونِ شریعت" رائج نہیں ہوا۔ ورنہ قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ تلوار تک پہنچتا، مولوی صاحبان کے فتاوی کفر و ارتداد خود اِن کا خاتمہ کر چکے ہوتے۔ ارتداد کی تلوار دو دھاری ہوتی ہے جو مسٹر اور مُلا دونوں پر چلتی ہے۔

خاتمۂ کلام

قتلِ مرتد کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات اور دلائل آپ کے سامنے آچکے۔ ان کے خلاف، قرآن کریم کے متعلقہ مقامات بھی آپ دیکھ چکے۔ ان کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ کیا قرآن کریم کی رو سے ایک مسلمان کے لئے تبدیلیٔ مذہب سزائے موت کا مستوجب ہوتی ہے اور کیا قرآن کا یہی منشاء ہے کہ ایسے لوگوں کو جن کا دل اسلامی آئیڈیالوجی سے مطمئن نہ ہو موت کے ڈر سے باندھ کر مسلمان بنائے رکھا جائے ؟ اگر آپ سمجھتے ہوں کہ قرآن کا فی الواقعہ یہ فیصلہ اور ایسا منشاء نہیں تو پھر سوچئے کہ کیا وہ روایات جن کی بنا پر قتلِ مرتد کی ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور مولوی صاحبان (اور ان کے نمائندہ، مودودی صاحب) کیا کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ایسی روایات جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں، قطعاً رسول اللہ کے ارشادات نہیں ہو سکتے اسلئے کہ ہمارے نزدیک اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) رسول اللہ کوئی ایسی بات کہہ یا کر سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔

لیکن اس کے برعکس، مولوی صاحبان (اور ان کے ترجمان مودودی صاحب) کا ارشاد ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم وہی ہے جو ان روایات کے اندر ہے۔

اس کے بعد خیال فرمائیے کہ ہمارا وہ کونسا جرم ہے جس کی پاداش میں ہمیں گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جا رہا ہے اور طلوعِ اسلام کے پیش کردہ مسلک کو دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ بتایا جاتا ہے ؟

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ذرا اس پر غور فرمائیے کہ اگر خدا نکردہ ملک میں وہ "نظامِ شریعت" رائج ہو گیا جس کے قیام کیلئے مودودی صاحب اور ان کی جماعت کوشاں ہے اور اس طرح تنفیذِ امورِ شریعت کی آڑ میں زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو پاکستان میں بسنے والوں کا کیا حشر ہو گا اور دنیا کس قسم کے اسلام کا تماشا دیکھے گی۔ کیا یہ اسلام اسی روحِ فرعونیت کا "مقدس پیکر" نہیں ہو گا جو ہر اس شخص کے خلاف جو اس سے ذرا سا بھی اختلاف رکھے، یہ کہہ کر فتوئ موت صادر کر دیتی تھی کہ

اٰمنتم بہٖ قبل ان اٰذن لکم۔ کیا تم نے ہماری اجازت کے بغیر ہی اپنا مذہب تبدیل کر لیا (اور موسیٰؑ پر ایمان لے آئے)

ہم جانتے ہیں کہ یہ محض عقیدے کی تبدیلی نہیں

ان ھذا المکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھا اھلھا فسوف تعلمون — یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جو اس نظام کا تختہ الٹنے کے لئے مخفی طور پر کی گئی ہے۔ اسلئے تمہیں ابھی معلوم ہو جائیگا کہ اس کا نتیجہ کیا ہے!

ڈرو ہمارے جبروت و قہرمانیت سے۔ (تمہیں اُلٹی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈلوائی جائیں گی (یا تمہارے ہاتھ اور پاؤں (لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ثم لاصلبنکم اجمعین) کٹوائے جائیں گے) اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔

یہ ہے اُس آنے والے زمانے کی دھندلی سی تصویر جس کی داغ بیل آج اس قدر معصومیت کے ساتھ، خدا اور رسول کے نام پر ڈالی جا رہی ہے۔

یلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا (۱۹/۲۳)

—— خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے ——

دو اعلانات

(۱) فروری ۱۹۵۲ء کا پرچہ جس میں پرویز صاحب کا مقالہ "اسباب زوال امت" دوبارہ شائع ہوا تھا اسقدر مقبول ہوا کہ (باوجودیکہ پرچہ عام تعداد سے بہت زیادہ چھپوایا گیا تھا) اس کی کوئی کاپی بھی باقی نہیں رہی اور اس کی مانگ بدستور چلی آرہی ہے۔ ہم باقیماندہ فرمائشوں کی تعمیل سے معذور ہیں، بجز اینکہ اس مقالہ کو الگ بھی شائع کیا جائے۔

(۲) محترم پرویز صاحب کا مقالہ "اسلامی نظام" بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا "اسباب زوال امت"۔ اس مقالہ میں تفصیل سے یہ بحث سامنے آگئی ہے کہ اسلامی نظام کے اصولی خطوط کیا ہیں اور اس کا آئین مرتب کس طرح ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ قرآن اور حدیث کا صحیح صحیح مقام کیا ہے؟ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مقالہ کو بھی مصنف کی نظر ثانی اور ضروری توضیحات کے بعد دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ اس کی افادیت عام ہو جائے۔ درحقیقت یہ مقالات ایسی بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان پر قرآنی فکر کی پوری عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ ان مقالات نے عصر رواں کے سوچنے والوں کی نگاہوں کے زاویے بدل دیئے ہیں۔

(طلوع اسلام)

مالی مدد

امریکہ سے جو ملک کو مالی مدد ملی — سب خوش ہوئے کہ قوم کی قسمت بدل گئی
دولت ہی دہر میں ہے اک درد کی دوا — دولت ملی ہر ایک بلا سر سے ٹل گئی
اس نسخۂ شفا سے مرض دور ہو گیا — اس کشتۂ طلا سے طبیعت سنبھل گئی
مرہم کے مانگنے کے لئے ہو گیا دراز — اُمید ہی سے خستگیٔ دستِ شل گئی
منظور اس کے ہونے میں کچھ بھی لگی نہ دیر — درخواست ورلڈ بنک میں کیا برمحل گئی
پیرِ مغاں کے فیض سے مے مل گئی اُدھار — انجام کچھ ہو آج تو حسرت نکل گئی
احسان مالیوں کا اٹھایا تو کیا ہوا — نخلِ ہوس کی شاخِ تمنا تو پھل گئی
معیار زندگی کا تو ہو جائے گا بلند — غیروں کے در پہ غیرت اگر سر کے بل گئی
جسوقت ڈالروں کا یہ چشمہ اُبل پڑا — سمجھو کہ آبِ زر کی یہاں نہر چل گئی
جلتی ہوئی زمین کو جل تھل بنائے گی — برسات سیم و زر کی جو نہی تا بہ تھل گئی
اس قرض سے نشاطِ تصور ہے اسقدر — گویا یہ سرزمین ہی جنت میں ڈھل گئی
اس جشنِ انبساط و مسرت کے درمیان — اکبر کی بات مُنہ سے اسد کے نکل گئی

"مچھلی نے ڈھیل پائی ہے طمعے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی"

اسد ملتانی

باب المراسلات

حیات بعد الممات

کوئٹہ سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:

(۱) آپ نے "طلوعِ اسلام" شمارہ دسمبر ۱۹۵۱ء کے باب المراسلات میں انسانی ارتقار کے بارے میں تحریر فرمایا:

جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔

کیا آپ مہربانی کر کے اس "اور نظام" پر روشنی ڈالیں گے کہ وہ نظام کیا ہے اور کس طرح بروئے کار آئے گا؟

رحمۃ العالمین

(۲) "طلوعِ اسلام" شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء میں آپ کا نشریہ بعنوان "رحمت اللعالمین" شائع ہوا۔ اس میں آپ نے رسول مقبولؐ کو نوعِ انسان کے لئے توکماحقہٗ رحمت اللعالمین ثابت کیا۔ لیکن کیا "رحمت اللعالمین" میں "عالمین" کا لفظ صرف نوعِ انسان تک ہی محدود ہے یا اس کا اطلاق تمام کائنات پر ہوا؟ اگر اس میں انسان کے علاوہ دیگر بھی جملہ موجودات و مخلوقات شامل ہیں تو پھر براہِ کرم مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

جواب پہلے سوال کے متعلق عرض ہے کہ زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات ہمارے حواس و احساسات ہیں اور ان کا تعلق محسوسات و مدرکات سے ہے۔ لہٰذا جو چیزیں اس دائرہ سے باہر ہوں ان کے متعلق ہم اپنے موجودہ ذرائع معلومات کی رو سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی۔ اس کا نظام کیا ہوگا۔ اس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ ہم نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے اسلئے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

علاوہ بریں موجودہ زندگی میں ہمیں اس کاوش کی بھی ضرورت نہیں کہ آنے والی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی۔ آنے والی زندگی کا یقین قانونِ مکافاتِ عمل کے لئے ضروری ہے۔ اور جس شخص کا ایمان ہے کہ زندگی غیر مسلسل ہے اس کا یہ ایمان قانونِ مکافاتِ عمل کی غیر منقطع ہمہ گیری کے لئے کافی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصورِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے۔

حیات بعد الممات میری تصنیف، سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی میں آتی ہے۔ اس وقت انشاء اللہ اس کے متعلق پورا پورا قرآنی تصور اور سائنس کے انکشافات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دوسرے سوال کے متعلق گذارش ہے کہ رسولوں کی بعثت ہمیشہ انسانوں کی طرف ہوتی ہے. قرآن میں اس کی صراحت (متعدد مقامات پر) موجود ہے. خود نبی اکرمؐ کو بھی تمام نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا. اندریں حالات رسالتِ محمدیہ کی رحمت بھی انسانی دنیا ہی کے لئے ہے. اس لئے عالمین میں انسانوں سے باہر کی دنیا شامل نہیں ہو سکتی۔ (پرویز)

۲- بیتابیٔ تمنّا

پشاور سے ایک نوجوان طالب علم کا خط:

میں طلوع اسلام سے اس کے دورِ اول سے متعارف ہوں اور اس کا مطالعہ کرتا آیا ہوں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ واقعی طلوعِ اسلام قرآنی انقلاب کا نقیب ہے. میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو اس بے باکی سے قرآنی نظام کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہو. مگر مجھے چند ایک خامیاں محسوس ہو رہی ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں. امید ہے کہ آپ میری تجاویز پر غور فرمائیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام کے صفحات میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ محض تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ وہ ذہنی دنیا میں ایک انقلاب آفریں قیامت برپا کر رہا ہے. اس کا اندازہ میں یا دیگر قارئین لگا سکتے ہیں آپ نہیں. کیونکہ

کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو ۔۔۔ دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر

اب اگر طلوع اسلام قرآنی انقلاب کا داعی ہے تو اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انقلاب بغیر قوت کے ناممکن ہے. اور یہ خیال بھی فرسودہ اور باطل ہے کہ پہلے ذہنوں میں انقلاب پیدا ہو جائے، تب عملی طور پر انقلابی قدم اٹھایا جا سکتا ہے. یہ خیال غلام ذہنیتوں کی پیداوار ہے' آزاد قوم کا ایک فرد بھی اگر کسی بات کو صحیح سمجھتا ہے تو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے. اگر اس کے دل میں شمع ایمان روشن ہے، اگر کوئی چنگاری عشق باقی ہے تو پھر میدانِ عمل میں جست لگانے میں وہ کوئی دیر نہیں کرتا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیئے قصے تمام ۔۔۔ اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اس لئے اپنے آپ کو کسی ایسے فریب میں مبتلا رکھنا کہ پہلے اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی سیرت پیدا کر لی جائے، تب یہ نظام نافذ ہو سکتا ہے کسی صورت میں بھی قرینِ ہوش و خرد نہیں. قرآن تو ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ جب تم حق کے کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو عملی قدم اٹھانے میں کوئی دیر نہ کرو. اس بات کا انتظار نہ کرو کہ دوسرے بھی تمہارے ساتھ آکر شامل ہوں. تب تم حق کی راہ میں عملی قدم اٹھاؤ. بلکہ اگر تمہارے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے والا کوئی بھی نہ ہو تو تم اکیلے ہی اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو. طریق کار کے لئے پروگرام بناؤ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ. ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادا. حق کی راہ میں پہل کرنے میں کسی دوسرے کا انتظار مت کرو. بلکہ خود کمربستہ ہو جاؤ. دوسرے تمہارے ساتھ آکر شامل ہو جائیں گے

میں جانتا ہوں کہ شاید آپ کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ فی الحال چونکہ پاکستان کے سارے مسلمان یا مسلمانوں کی اکثریت طلوع اسلام کے ہمنوا نہیں بنے اور ملا کے پُرفریب جال میں پھنسے ہوئے اسلام کے متعلق کچھ نرالے ہی قسم کے تصورات لئے بیٹھے ہیں. اس لئے پہلے مُلا کے پیدا کردہ ان باطل تصورات کو دفن کر دیا جائے. مگر آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے. صبح طلوع ہو گا تب ہی رات کی بھیانک سیاہی ختم

ہوگی۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ رات کی سیاہی کو کہیں کہ وہ چلی جائے کیونکہ آپ چاہتے ہیں سورج طلوع ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا، اور نہ ہوگا۔ آپ اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایک عملی قدم اٹھائیں۔ وہ عملی قدم خود ہی اباطیل کے ان ہٹ دھرم اور خودسر خداؤں کے لئے پیغامِ موت ہوگا۔

فسوں تمہاری خدائی کا ٹوٹ جائے گا   سیاہیوں کے خداؤ! سحر قریب آئی

اس کے علاوہ آپ ایک اور غلط فہمی میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی عملی قدم اٹھایا تو آخر وہ کسی منظم پروگرام کے ماتحت اٹھایا جائے گا۔ اور اس کے لئے ایک خاص (پارٹی) جماعت کی ضرورت ہوگی۔ جب ایک ایسی جماعت بنا دی جائے تو وہ فرقہ بندی کے حکم کے نیچے آجائے گی۔ اور ازروئے قرآن فرقہ بندی شرک ہے۔ مگر آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ وہ فرقہ بندی شرک ہے جو حق کے خلاف ہو۔ فرقے کا اطلاق اس جماعت پر نہیں ہوسکتا جو حق پر ہو۔ ورنہ وہ لوگ جو حق پر ہوں ان کا تو یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ باطل کے خلاف ایک منظم دفاع قائم کریں۔ اس لئے جب ہم اور آپ حق پر ہیں تو یہ فرقہ بندی ہوئی یا شیرازہ بندی؟ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی ایسی جماعت کی بڑے زور شور سے مخالفت ہوگی۔ اس کو مٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جائے گا۔ مگر کیا ان الباطل کان زھوقا پر آپ کا ایمان نہیں؟ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ آخر فتح حق کی ہوگی؟ ہاں درمیان میں بڑی بڑی صبر آزما مصیبتوں اور آزمائشوں سے گذرنا پڑے گا۔ اور کیا آپ ان آزمائشوں سے جی چراتے ہیں؟ گھبراتے ہیں، مخالفت سے ڈرتے ہیں، حکومت سے خوف کھاتے ہیں۔ خدا کے سوا وہ کونسی طاقت ہے جس سے آپ سہمے ہوئے ہیں اور حق کی راہ میں عملی قدم اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ مخالفت تو ہر وقت ہوگی۔ آج بھی ہوگی اور دس بیس سال بعد بھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ بغیر کسی مخالفت کے طوفان سے ٹکرانے کے، بغیر موجوں کے تھپیڑے کھانے کے یہ کشتی ساحلِ منزل پر پہنچ جائے گی۔ اسلامی نظام کے قیام کے لئے کئی فرعونوں، کئی ہامانوں، اور کئی قارونوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ آخری فتح ہماری ہوگی۔ جب یہ مخالفت ہونی ہے، جب یہ مقابلہ کرنا ہے، جب ان طوفانوں سے ٹکرانا ہی ہے جب ان تند و تیز موجوں کے تھپیڑے کھانا ہی ہیں تو آج ہی سے کیوں نہ ہم اپنی تنظیم شروع کردیں۔ بڑے پیمانہ پر نہ سہی چھوٹے پیمانے پر سہی۔ حق کی اس جماعت کے ہزاروں اور لاکھوں ممبر نہ سہی چند سو ہی سہی، مگر ہمیں اس کی ابتدا کر دینی چاہئے۔ اور اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ زمانے کے احوال وظروف کے مطابق مئے یثرب کو آج ہی کے پیمانوں میں ڈال کر زمانے کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ ذاتی اقتدار نہیں بلکہ قرآن کے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے آج کا عصائے کلیمی ایک سیاسی جماعت کا قیام ہے۔ کیونکہ آج کے فرعونوں اور ہامانوں کے ساحرین کے سانپ بھی اسی قسم کے ہیں۔ دیکھئے یہ سبق ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ملتا ہے۔ اگر فرعون اپنے ساحرین کو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر نہ لاتا، اور ساحرین اپنی رسیوں سے سانپ نہ بناتے بلکہ کچھ اور کرتے تو موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی کبھی اژدہا نہ بنتا۔ بلکہ وہ وہی کچھ بنتا جو ساحرین بنانے، نگران کے طلسم سے زیادہ قوی اور مضبوط۔ اسی طرح آج اقتدار حاصل کرنے کے لئے اگر سیاسی قوت کی ضرورت ہے تو ہمیں بھی یہ قوت حاصل کرنی چاہئے۔ کیونکہ نظام کی تبدیلی سیاسی اقتدار کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی عصائے کلیمی ہے جو باطل کے فرقوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج سیاست کے بازار میں جھوٹ، فریب، دغا، مکاری، مصلحت کوشی،

انہی چیزوں کا چلن ہے۔ مگر یہ تو اس وجہ سے ہے کہ موجودہ سیاست چند لوگوں کی ذاتی نفع کوششوں کے لئے ہے۔ وہ قوم کو EXPLOIT کر کے اپنی ذاتی اغراض کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بوقت ضرورت انھیں جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، دھوکا بھی دیتے ہیں، مکاری بھی کرتے اور مصلحت کوش بھی ہوتے ہیں۔ مگر ہماری سیاست کسی فرد کے ذاتی اقتدار کے لئے نہیں بلکہ قرآنی نظام کے قیام و نفاذ کے لئے ہوگی۔ اور قرآنی سیاست کی پالیسی بھی کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں بلکہ قرآن کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کو سمجھنے والا مسلمان ایک اچھا خاصا سیاستداں ہو سکتا ہے مگر ہاں ایک بات اور بھی ضروری ہے کہ وہ ان باطل کے سیاستدانوں کا مقابلہ اسی وقت اچھی طرح سے کر سکتا ہے جبکہ ان کی چالوں سے واقف ہو۔ بہرکیف میرا مطلب ہے کہ طلوع اسلام کو پڑھنے والے اور اسلامی طرزِ فکر پر سوچنے والے ایک جگہ جمع ہو کر ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھدیں۔ اور اس جماعت کے سیاسی مقاصد صرف قرآنی نظام کا قیام ہو۔ مجھے یقین ہے کہ طلوع اسلام نے اپنی نو سالہ زندگی میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایسے نوجوان پیدا کئے ہوں گے جو کسی ایسی دعوت کے لئے گوش برآواز ہوں گے۔ بس ایک مضراب کی ضرب سے ان خاموش تاروں کو چھیڑنے کی ضرورت ہے۔

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے

طلوع اسلام یہ خط نمونہ ہے ان سینکڑوں خطوط کا جو نوجوانانِ ملّت کی طرف سے ہمیں اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں اور ترجمانی کرتا ہے ہزاروں ان قلوب کی جو ہمارے صالح نوجوانوں کے سینے میں دھڑک رہے ہیں قوم کے لئے یہ فالِ نیک ہے اور طلوع اسلام اس احساس سے بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہے کہ اس کی محدود سی کوششیں فضا میں اس درجہ ارتعاش پیدا کر رہی ہیں۔

جہاں تک ہمارے اس عزیز کا تعلق ہے ہم صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھتے ہیں کہ وہ جب اپنی زندگی کی موجودہ منزل سے آگے بڑھیں گے تو وہ خود محسوس کریں گے کہ قوموں میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی انقلاب کے لئے کوشش "کچھ کم "عمل" نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ ہماری زندگی ایک ایسے "سنسنی خیز" ہنگامی دور سے گذر رہی ہے کہ ہم فکری تبدیلی کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سیاسی ہنگامہ خیزیاں ہی "عمل" کہلانے کی مستحق ہیں۔ اگر یہ ہو گیا تو سب کچھ ہو گیا اور اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ہمیں امید ہے کہ ہمارے یہ عزیز ذرا اور آگے بڑھ کر ہم سے متفق ہو جائیں گے کہ صحیح انقلاب قلب و نگاہ کی تبدیلی کے بغیر ناممکن ہے۔ طلوع اسلام سرِدست اسی خاموش انقلاب کے دور سے گذر رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ

بانشۂ درویشی در ساز و دما دم زن — چو پختہ شدی خود را بر سلطنتِ جم زن

ضروری وضاحت بھارت سے ایک دوست نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ میرے مقالہ "اسباب زوال امت" (مطبوعہ طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۵۲ء) میں دو مقامات پر آیات کے ترجمے میں کچھ الفاظ رہ گئے ہیں۔

(i) صفحہ ۲۵ - انا لننصر رسلنا ۔ ۔ ۔ ۔ میں حسب ذیل خط کشیدہ الفاظ -

" ہم اپنے رسولوں کی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ii) صفحہ ۲۲ - ان فی خلق السمٰوٰت والارض ۔ ۔ ۔ ۔ میں حسب ذیل خط کشیدہ الفاظ -

" وہ ارباب دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے بیٹھے لیٹے ہمیشہ قانون خداوندی کو سامنے رکھتے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً (۲۶/۲) میں بہٖ کی ضمیر کا مرجع مثل ہے (جو آیت میں اس سے پہلے آیا ہے) نہ کہ قرآن - اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس مثال سے جو اللہ نے قرآن میں بیان کی ہے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصے میں گمراہی آئیگی " یعنی یہ چیز اس مثال کے متعلق ہے نہ کہ قرآن کے متعلق۔

میرے نزدیک یہ فرق بلا تخصیص ہے۔ قرآن اپنے مافیہ (CONTENTS) ہی کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کا انکار کرتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ قرآن کا انکار کرتا ہے۔ اگر اس کی کسی بیان کردہ مثال کی تضحیک کرتا ہے تو وہ قرآن ہی کی تضحیک کرتا ہے۔

بہر حال میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری توجہ ان مقامات کی طرف دلائی۔

اس ضمن میں میں ایک اور بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآنی آیات کے ترجمے میں ایک اسلوب تو وہ ہے جس کی رو سے آیات کا ترجمہ لفظی ہوتا ہے۔ دوسرا اسلوب وہ ہے جس کی رو سے لفظی ترجمہ کے ساتھ قوسین کے اندر توضیحی عبارات بڑھادی جاتی ہیں۔ میں نے ان دونوں اسالیب کو ناقص پایا ہے۔ یعنی ان سے قرآنی آیات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے میں اپنی تحریروں میں بالعموم آیات کا "مفہومی ترجمہ" دیتا ہوں۔ یعنی لفظی ترجمہ کی بجائے ان کا مفہوم۔ اس مفہوم میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں کوئی بات اپنی طرف سے نہ بڑھائی جائے (اسلئے کہ میرے نزدیک قرآنی تعلیم میں انسانی ذہن کی طرف سے اضافہ کھلا ہوا شرک ہے) جو کچھ مفہوم بیان کیا جائے وہ قرآن ہی کا بیان کردہ مفہوم ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ قرآن کی کسی ایک آیت کے مفہوم میں اس کی کسی دوسری آیت سے مدد لی جائے۔ اسلئے کہ تصریف آیات کے ذریعے تعینِ مفہوم خود قرآن کا انداز ارشاد ہے۔ اس احتیاط کے باوجود، میں اپنی تحریروں میں قرآن کی آیات بھی نقل کر دیتا ہوں اور ان کا حوالہ بھی دیدیتا ہوں۔ آپ ان آیات کو خود قرآن سے نکال کر دیکھئے اور اس کا اطمینان کر لیجئے کہ میرا بیان کردہ مفہوم قرآنی الفاظ کے خلاف تو نہیں جاتا۔ اگر اس باب میں آپ کو کسی مقام پر شبہ گذرے، تو مجھ سے دریافت فرمالیجئے۔ اگر میرا مفہوم درست ہوا تو میں اس کی مزید وضاحت کی کوشش کرونگا۔ اگر کہیں مجھ سے سہو ہو گیا ہو تو اس کی اصلاح کر لوں گا اور آپ کا سپاس گذار ہوں گا۔

اس حقیقت کو بھی ہمیشہ اپنے سامنے رکھئے کہ قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے۔ اسلئے دنیا کا کوئی ترجمہ، کوئی مفہوم یا کوئی تشریح و تفسیر، کسی صورت میں بھی ہمیں قرآن کے الفاظ سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ میں قرآنی آیات کا جو مفہوم پیش کرتا ہوں آپ اسی پر اکتفا نہ کیجئے، خود قرآن کو دیکھئے۔ میری ساری کوشش یہ ہے کہ میرے بھائی خود قرآن کو براہ راست سمجھنے کا شوق اور صلاحیت پیدا کریں۔ اور بس!

(پرویز)

حقائق و عبر

۱۔ وہ بھی شریعت یہ بھی شریعت

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی قوم کی اخلاقی سطح کتنی بلند ہے تو دیکھنا یہ چاہئے کہ دوسری قوموں کے ساتھ معاہدات کے معاملے میں اس کی روش کیا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کے متعلق ایک مسلک تو وہ ہے جسے یونان کے مدبر و مفکر سولن نے ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور جس پر ابلیسی سیاست کا عملدرآمد رہا ہے اور آج بھی ہے۔ یعنی

معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اور اپنے سے طاقتور کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے برعکس دوسری روش وہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے اور جس کی رو سے اس نے امت مسلمہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

والموفون بعهدهم اذا عاهدوا

وہ لوگ جو معاہدہ کرنے کے بعد اسے پوری طرح نباہتے ہیں۔

اور۔ ولا ینقضون المیثاق۔ وہ کبھی عہد و پیمان کو نہیں توڑتے۔ قرآن نے معاہدات کی پابندی کے لئے کس شدت سے تاکید کی ہے، اس کے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ (نہ ہی اس کی تفصیل اس وقت ہمارے پیش نظر ہے)۔ اس وقت، اس مختصر سی تمہید کے بعد ہمیں کچھ اور عرض کرنا ہے۔

گزشتہ نومبر میں، کراچی میں اسلامی جماعت کا اجتماع ہوا۔ اس میں امیر جماعت، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اپنی جماعت کے موقف اور اس کے مختلف اہم فیصلوں کی تائید میں بہت کچھ بیان فرمایا۔ اسی ضمن میں معاہدات کے متعلق بحث سامنے آگئی تو انھوں نے فرمایا:

حقیقت یہ ہے کہ اصول اخلاق کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے ان معاہدات میں جو دو فریق اپنی آزاد مرضی اور مساویانہ طریقہ سے باہم طے کریں، اور ان معاہدات میں جو ایک فریق کی کمزوری یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرا فریق حاصل کرلے۔ اخلاق کی نگاہ میں یہ دو الگ الگ نوعیتوں کے معاہدے ہیں اور ان دونوں کا حکم ہرگز یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو معاہدے فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے ہوئے ہوں وہ یقیناً وزنی اور قیمتی معاہدے ہیں، ان کی پوری پوری پابندی ہونی چاہئے۔ ان کی خلاف ورزی حرام ہے ان میں کسی قسم کے ردوبدل کا ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے نہ ہوا ہو، بلکہ جس کو ایک فریق نے اپنے زور سے حاصل کیا ہو اور دوسرے نے اپنی کمزوری یا مجبوری کی بنا پر مانا ہو، وہ اخلاقی حیثیت سے کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے۔ جب تک وہ حالات باقی رہیں

جن میں اس نوعیت کا معاہدہ ہوا تھا۔ صرف اسی وقت تک ایسا معاہدہ نافذ العمل رہ سکتا ہے۔ اور جب حالات بدل جائیں، جب ظالم کا زور ٹوٹ جائے اور مظلوم کی کمزوری یا مجبوری باقی نہ رہے، ایسے معاہدے کو آپ سے آپ ٹوٹ جانا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ جو اخلاقی ذمہ داری مظلوم فریق پر عائد ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات بدل جانے پر وہ پہلے ظالم فریق کو معاہدے پر نظر ثانی کرنے کرنے کی دعوت دے۔ لیکن اگر اس کے دعوت دینے کے باوجود ظالم فریق نہ مانے تو مظلوم فریق کو پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کا معاہدہ اس کے منہ پر مار دے، یا معاہدے میں انصاف کے مطابق ترمیم کر دے۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ کوئی میرا من گھڑت اخلاقی اصول نہیں ہے، بلکہ شریعت اسلامی میں اس کی بنیاد موجود ہے۔ اسلامی قانون سود کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق اپنی برتر مالی پوزیشن کی بنا پر سود کی شرط عائد کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مالی کمزوری اور اپنے حالات کی مجبوری سے اس شرط کو قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون بیع مضطر کو بھی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق دوسرے کو پریشان حال دیکھ کر اس کی ۱۰۰ روپے مالیت کی چیز کے پانچ روپے دام لگاتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مصیبت سے مجبور ہو کر ان داموں اپنی چیز بیچ دیتا ہے۔ یہ اصول صرف شخصی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی معاملات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے معاہدے کو لیجئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان طے ہوا تھا۔ اس معاہدے میں منجملہ دوسری شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینے سے جو لوگ بھاگ کر مکہ جائیں گے انھیں تو کفار مکہ واپس نہ کریں گے، مگر مکہ سے جو لوگ بھاگ کر مدینے جائیں گے انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دینگے۔ یہ صریح طور پر ایک غیر معقول اور غیر منصفانہ شرط تھی جو کفار مکہ کے اصرار پر مانی گئی تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس مجبوری سے اس کو قبول کیا تھا کہ کفار مکہ اس کے بغیر آپ کو اور مسلمانوں کو زیارت کعبہ کا حق دینے کیلئے تیار نہ تھے، حالانکہ عرب کے قدیم ترین مسلمہ قاعدے کے مطابق نہ حرم کعبہ اہل مکہ کی جائداد تھا اور نہ انھیں کسی کو اس کی زیارت سے روکنے کا، یا اس پر کوئی شرط عائد کرنے کا حق تھا۔ اس لئے ان کی یہ شرط قطعی غیر منصفانہ تھی اور ایک صاحب حق کی مجبوری سے بالکل ناجائز فائدہ اٹھا کر منوائی گئی تھی۔ اب دیکھئے کہ قرآن اس شرط کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق تھا، قرآن نے اس کو باقی رہنے دیا۔ مگر جب کچھ عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینے آئیں اور کفار مکہ نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو قرآن میں صاف حکم آ گیا کہ ان عورتوں کو واپس نہ کیا جائے۔ یہ صریح طور پر بین الاقوامی معاہدے کی یک طرفہ ترمیم تھی، اور اس کے جواز کی اس کے سوا اور کوئی بنیاد نہ تھی کہ جس معاہدے کو ایک فریق نے دوسرے فریق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرایا ہو اس کی اخلاقی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جو فریقین کی مساویانہ اور آزادانہ مرضی سے طے کئے ہوئے معاہدوں کی ہوتی ہے۔ اس طرح کے ایک معاہدے میں مظلوم فریق کو حق پہنچتا ہے کہ اگر پورا معاہدہ ظالمانہ ہو تو موقع پا کر اسے ظالم کے منہ پر مار دے، اور اگر معاہدے کی کچھ شرطیں ناقابل برداشت ہوں تو انصاف کو ملحوظ رکھ کر ان میں مناسب ترمیم کر دے۔ یہ ایک مستقل اصول ہے جو قرآن کے اس فیصلے سے مستنبط ہوتا ہے۔

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مودودی صاحب نے معاہدات کی جو تقسیم کی ہے وہ کیسی ہے اور اس میں جس "اخلاقی اصول"[1] کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی حیثیت کیا ہے۔ اس وقت صرف یہ دیکھنا ہے کہ مودودی صاحب نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ معاہدہ کرنے کے بعد اگر کمزور فریق کے حالات تبدیل ہو جائیں تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ معاہدہ کی جس شق کو غیر منصفانہ سمجھے اس میں یک طرفہ ترمیم کرلے۔ اس سے نقضِ عہد کا جرم عائد نہیں ہوتا۔ اس کے لئے انھوں نے "خدا کے حکم اور رسول اللہ کے عمل" سے تائیدی شہادت بہم پہنچائی ہے۔ (جس کے متعلق ہم آگے چل کر عرض کریں گے)۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا ان میں بنیادی نقطہ یہ تھا کہ حکومت پاکستان کی یہ روش کہ اس نے ہندوستان سے ساتھ صلح کا معاہدہ بھی کر رکھا ہے اور کشمیر میں جنگی کارروائی بھی جاری ہے۔ شریعتِ اسلامی کے یکسر خلاف ہے۔ اس باب میں انھوں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

> اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ یا تو کسی قوم سے معاہدہ نہ کرو۔ یا اگر معاہدہ کرتے ہو تو پھر پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی پابندی کرو۔ اور جب دیکھو کہ فریق ثانی اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو اس کا معاہدہ کھلم کھلا اس کے منہ پر مار دو۔ پھر تم آزاد ہو کہ اس کے خلاف جو کارروائی کرنا چاہو کرو۔
>
> وان تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء۔ ان اللہ لا یحب الخائنین۔
>
> اور اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو تو برابری کے ساتھ ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو (یعنی اس طرح کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ تمہارا اور ان کا معاہدہ باقی نہیں رہا) حقیقت یہ ہے کہ اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ۱۹۴۸ء)

یہاں مودودی صاحب نے معاہدات کی کوئی قسمیں نہیں گنائیں مطلق معاہدہ کے متعلق یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ یا تو اس کی پوری پوری پابندی کرو اور یا اسے فریقِ مقابل کے منہ پر دے مارو۔ یہ نہیں کہ اس کی کسی ایک شق میں از خود یک طرفہ تبدیلی کر لو۔ اس کے بعد انھوں نے ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۸ء میں) اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں لکھا تھا۔

> اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں) تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سرِ مو بھی تجاوز نہ کیا جائے بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت اور قوت (RELATIVE POSITION) میں کتنا فرق آجائے۔

---

[1] یہ بحث کسی دوسرے وقت کی جائے گی۔ اس وقت صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ معاہدات کا قیام و توثیق کسی قانون کی رو سے ہوتا ہی نہیں۔ ان کا سارا دار و مدار اخلاقی ضابطہ کی رو سے ہوتا ہے۔ جسے "بین الاقوامی قانون" کہا جاتا ہے اس کی حیثیت درحقیقت قانون کی نہیں ہوتی۔ کیونکہ قانون اسے کہتے ہیں جسے کوئی قوت نافذہ منوا سکے۔ جب تک بین الاقوامی قانون کے پیچھے اس قسم کی قوت نافذہ نہ ہو اس وقت تک بین الاقوامی معاہدات کی حیثیت قانون کی نہیں ہو سکتی۔ ان کی حیثیت محض اخلاقی پابندی کی ہوتی ہے۔

اس سے بھی پہلے انھوں نے اپنی کتاب الجہاد فی الاسلام میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

اسلامی قانون نے جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی سخت تاکید کی ہے۔ حقیقۃً اخلاقیاتِ اسلام کے قواعد اصلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے۔ بدعہدی سے خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ پہنچتا ہو اور وفائے عہد سے کتنا ہی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اسلام بہرصورت اپنے پیروں کو تاکید کرتا ہے کہ اس فائدے کو چھوڑ دیں اور اس نقصان کو برداشت کریں ...... یہ کلیہ جس طرح انفرادی و شخصی زندگی پر حاوی ہے اسی طرح اجتماعی و قومی زندگی پر بھی حاوی ہے ...... اسلام اس معاملے میں فرد اور جماعت، رعیت اور حکومت، شخص اور قوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اور بدعہدی کو ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز قرار دیتا ہے۔ (ص۱۵۱)

اس ضمن میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل فرمائی ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا۔ جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے۔ یا پھر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کا نوٹس دیدے۔ (ص۱۸۳)

دونوں باتیں آپ کے سامنے آگئیں۔ پہلے شریعت کا فیصلہ یہ تھا کہ

(۱) اسلام کے قواعد اصلیہ میں سے یہ ہے کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے۔

(۲) بدعہدی ہر حال میں ہر غرض کیلئے ناجائز ہے۔

(۳) شرائط معاہدہ مرغوب ہوں یا نہ، ان میں سرمو تجاوز نہیں کیا جا سکتا خواہ فریقین کی اعتباری حیثیت میں کتنا ہی فرق آجائے۔

(۴) رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو جائے تو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت نہ گذر جائے۔

اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ

(۷) جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریق پر طے نہ ہوا ہو ...... اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے۔ حالات بدل جانے پر اس میں یک طرفہ ترمیم بھی کی جا سکتی ہے۔

اور اس کے لئے بھی (بزعم خویش) خدا کا حکم اور رسول اللہؐ کا عمل بطور تائید پیش کر دیا جاتا ہے۔

ایسے اہم معاملے میں اس قسم کے متضاد احکام اور دونوں احکام شریعت! ہم اس باب میں کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ مودودی صاحب نے اپنے فتوے کی تائید میں خدا اور اس کے رسول کے خلاف جو بہتان تراشا ہے (کہ صلح حدیبیہ میں پہلے یہ شرط داخل کرلی کہ جو لوگ مکہ سے بھاگ کر مدینہ جائیں گے انھیں واپس کر دیا جائے گا اور اس کے بعد اس میں از خود یہ ترمیم کرلی کہ واپس صرف مردوں کو کیا جائے گا عورتوں کو نہیں) اس کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اول تو

معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے واپس چلا جائے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائیگا اس میں صرف مرد داخل تھے۔ (سیرۃ النبی از شبلی۔ حصہ اول۔ ص۴۲۳)

اور اگر مودودی صاحب کو اس پر بھی اصرار ہو کہ نہیں، معاہدہ میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ تو

ہم انھیں چیلنج دیتے ہیں کہ وہ قرآن سے یہ ثابت کردیں کہ اس نے جن مہاجرات کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اگر اپنے ایمان میں مخلص ہوں تو انھیں ان کے کافر شوہروں کی طرف نہ لوٹایا جائے۔ وہ عورتیں معاہدۂ حدیبیہ کے بعد (اور اس کی مدتِ نفاذ کے اندر) مکہ سے مدینہ آئی تھیں۔

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ۔

۲۔ اب حرام ہے پچھلے دنوں کراچی کے درودیوار پر حسب ذیل استفتاء اور اس کا جواب چسپاں دکھائی دیا۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درمیان اس مسئلہ کے کہ اکثر مسلم قومی جماعتوں کی طرف سے مملکتِ پاکستان میں لاٹریاں نکلوائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آجکل کراچی مسلم لیگ کی جماعت جو کہ اپنے آپ کو مسلمانانِ کراچی کی نمائندہ کہتی ہے لاٹری کا لالچ دے کر دس دس روپے کے ٹکٹ فروخت کرتی ہے اور ٹکٹ خریدنے والوں کو تعمیر شدہ مکانات، موٹریں، ریڈیو وغیرہ بذریعہ لاٹری انعام میں دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ لہذا سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ (۱) کیا لاٹری شرع محمدی کے مطابق میسر (جوا) کی تعریف میں آتی ہے؟ (۲) اگر آتی ہے تو کیا شرع محمدی کے مطابق کسی مسلم جماعت کا لاٹری نکلوانا یا نکالنا خواہ کسی کام کے لئے کیوں نہ ہو شرعاً جائز ہے؟ (۳) کیا اس لاٹری کے نام اور ذریعے سے حاصل کیا ہوا روپیہ شرع محمدی کے مطابق حلال ہے یا حرام اور یہ روپیہ مسلمانوں کو کھلانا یا ان پر صرف کرنا جائز ہے؟ (۴) کیا یہ جائز ہے کہ فقراء و مہاجرین کی آبادکاری یا امداد کے لئے ان ذرائع سے روپیہ جمع کیا جائے جیسا کہ کراچی مسلم لیگ کے اشتہارات بابت لاٹری و نمائش کے موضوع میں مسلمانوں کو سمجھایا جاتا ہے؟

(مصطفٰے اعظم شاہ صدر ناظم آباد مسلم لیگ کراچی)

جواب:۔ (منجانب مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہٗ، مفتی اعظم پاکستان)

الجواب

(۱) لاٹری کے مروجہ طریقے سب کے سب قمار اور میسر (جوئے) کے تحت داخل ہیں۔ جن کی حرمت قرآن مجید میں بڑی شدت کے ساتھ آئی ہے۔ انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ۔ (۲) قطعاً حرام ہے۔ (۳) لاٹری کے ذریعہ حاصل شدہ مال بھی حرام ہے۔ اس کا خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا بھی عام حالات میں حرام ہے۔ (۴) ایک اسلامی ضرورت یا کسی امر مستحب و ثواب کے لئے حرام ذرائع آمدنی استعمال کرنے کا شریعت اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ اسلئے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے حرام ذرائع آمدنی مہیا کرنا سخت غلطی اور گناہ عظیم ہے۔ (واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم)

(دستخط) بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ کراچی آرام باغ ۳۰ ربیع الثانی

جوابات میرے علم میں صحیح ہیں۔ (دستخط) سید سلیمان ندوی)

سوالات مندرجہ بالا میں جو صورتیں دریافت کی گئی ہیں وہ شریعت کی رو سے صریح جوئے اور قمار کی فریب دہ صورتیں ہیں۔ اسلامی مملکت میں ایسی محرمات جاری ہونا انتہائی قابلِ شرم ہے۔ (دستخط) بندہ احتشام الحق عفی عنہ تھانوی)

قرآن کریم نے سلطنتیں عطا فرمانے کے بعد امراد عاملین کو جو ہدایات دی ہیں ان میں اقام الصلوٰۃ کے بعد محرمات شرعیہ کو روکنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ جوا ہر حال جوا ہے خواہ کسی بھی جماعت کی طرف سے ہو وہ حرام ہے۔ پھر اسلامی حکومت میں ان حرامکاریوں کی ترویج صد درجہ قابلِ نفرت و شرم ہے۔ اولین فرصت میں اس کا بند کرنا ضروری ہے۔ (دستخط) عبدالحامد قادری بدایونی)

تشکیلِ پاکستان کے بعد متعدد نمائشیں لگیں۔ بہت سے "مینا بازار" منعقد ہوئے۔ ان کے لئے انعامی ٹکٹ بکے۔ لاٹریاں نکالی گئیں۔ لاٹریوں میں انعام بٹے۔ لاٹریاں، قوم کی بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں نے نکالیں۔ انعامات معزز خواتین و بیگمات کے ہاتھوں تقسیم ہوئے۔ یہ سب کچھ دارالخلافت کراچی میں بجلی کی جگمگاتی روشنی میں ہوتا رہا۔ حضرات علمائے کرام اسی کراچی میں موجود تھے۔ کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ ان خرافات کے خلاف ایک حرف بھی زبان تک لائے۔ لیکن اب حالات میں کیا اہم تبدیلی پیدا ہو گئی جو اُسی قسم کے لاٹری کے اعلان پر . . . . حضرات علمائے عظام کی رگِ شریعت پھڑپھڑا اٹھی اور جھٹ سے فتویٰ سرِ بام آ گیا۔ ہم گنہگاروں کے نزدیک تو لاٹری (اور قرعہ اندازی) جیسی اب ناجائز ہے ویسی پہلے بھی تھی۔ لیکن کیا کوئی ان مفتیانِ دین مبین اور حاملانِ شرعِ متین سے اتنا پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہے کہ لاٹری پہلی نمائشوں میں حرام کیوں نہ تھی اور اب کیوں حرام ہو گئی؟[1] معلوم ہوتا ہے کہ بنیئے کے غصے کی طرح مُلا کا فتویٰ بھی بڑا سمجھدار واقعہ ہوا ہے۔ وقت بے وقت میں تمیز کر لیتا ہے۔ بالآخر "باب الحیل" بھی تو فقہ کی کتابوں کا ایک جزو ہے۔

---

[1] معلوم نہیں کہ مولوی صاحبان اس کا کیا جواب دیں گے کہ اگر قرعہ اندازی سے انعامات کا فیصلہ کرنا حرام ہے تو اس حدیث کے متعلق کیا سمجھا جائے جس میں لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا کرتے تھے کہ ازواج مطہرات میں سے کسے سفر میں ساتھ لیجایا جائے۔

خوارج

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کا یہ مضمون اس دفعہ بھی قلتِ گنجائش کی وجہ سے روک لینا پڑا۔ انشاء اللہ اگلے پرچے میں ضرور شائع ہوگا۔

❊

FIRDAUS TRADING CORPORATION

Clearing & Forwarding Agents

&

Cotton Merchants

*

SERAI ROAD,
KARACHI.

فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس اینڈ کاٹن مرچنٹس

سرائے روڈ۔ کراچی

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعہ سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے
جو اہلِ زبان بولتے ہیں

نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے اسکے کیلئے ضروری ہے۔ آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں، لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشیں ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کیلئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے، اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سنکر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقہ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھدیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں، یا سیر گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائینگے، زبان سیکھنے کے لئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے، مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے۔ فوراً تفصیلی جواب دیا جائیگا؛

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی ....
عربی	بنگالی	ہندوستانی ....
فرانسیسی	روسی	چینی ....
اسپینش	اطالوی	ڈچ ....
سویڈش	نارویجن	فنش ....
زرج	پولش	لاطینی ....
یونانی	ایفک	ملائے ....
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی ....
جرمن	ترکی	پرتگالی ....

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (x) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض ....

نام ....

پتہ ....

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی۔

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جسمیں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے۔ بھیجدیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے / نہیں ہے

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road
KARACHI

BRANCHES:—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY.

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for :—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London —
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London —
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن ــــ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے محصولڈاک ایک روپیہ دو آنے۔

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز

ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصولڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS
BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil

High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam, issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.